طلوعِ اسلام

جون ★ ۱۹۵۳

-/10/-

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ————

۱ تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳ حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

۴ حضور نبی اکرمؐ نے انسانی سیرت و کردار کے بہترین نقوش [illegible] ہماری تاریخ میں [illegible] کی سیرت کا بہترین معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵ قرآن کی رو سے دین یہ ہے کہ تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد کی حیثیت سے [illegible] ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کریں۔

۶ اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ انسان [illegible] قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں [illegible] جزئی قوانین خود مرتب کریں [illegible] یہ جزئی قوانین حالات کے ساتھ بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷ اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو [illegible]

۸ ربوبیت کے اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرہ کی تحویل میں رہیں [illegible] اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ [illegible] پاکستان [illegible] قرآنی نظامِ ربوبیت [illegible] نور سے جگمگا اٹھے۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں [illegible] تو طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مرتّب	بدلِ اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۶	جون ۱۹۵۳ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

لمعات	۴
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں (محترم خورشید عالم صاحب)	۱۶-۱۸
طاہرہ بیٹی کے نام . . . . (محترم پرویز صاحب)	۱۹-۳۶
مسلمانوں میں ملوکیت کی ابتدا	۳۷-۵۲
کیا اسلام میں نظامِ جاگیرداری کی گنجائش ہے؟ (سید مناظر احسن صاحب گیلانی)	۵۳-۷۰
باب المراسلات: ابوذر غفاریؓ کے بعد (محترم عرشی صاحب)	۷۱-۷۳

سیرت صاحب قران خود قران کے آئینہ میں

معراج انسانیت

معارف القرآن - جلد چہارم

گذشتہ سالون میں معارف القران کی قیمت میں محدود عرصہ کیلئے رعایت کردی گئی تھی جس سے قارئیں طلوع اسلام نے فائدہ اٹھایا لیکن پھر بھی بہت سے شائقین محروم رھگئے - چونکہ طلوع اسلام کا نیا لٹریچر بڑی تیزی کیساتھ شائع ھورہا ھے جس کیلئے ادارہ کو کافی سرمایہ کی ضرورت ھے - اسلئے پھر فیصلہ کیا گیا ھے کہ . . . . . .

معراج انسانیت

اور

نوادرات

کی قیمتوں میں مزید دو ماہ کیلئے رعایت

کردی جائے - یہ رعایت یکم جون سے ۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء تک رھیگی اس دوران میں معراج انسانیت بیس روپئے کے بجائے صرف پندرہ روپئے میں اور نوادرات چار روپئے کے بجائے صرف تین روپئے مین مہیا کی جائینگی - محصول ڈاک و پیکنگ ھر حال مین بذمہ خریدار ھوگا جو علی الترتیب ایک روپیہ سات آنے اور دس آنے ھے -

ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سورۂ انفال کی پینسٹھویں آیت میں ایک ایسی عظیم الشان حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے قوموں کی زندگی اور موت اور ان کے عروج و زوال سے متعلق ایک بنیادی اصول کی عظمت و اہمیت ابھر کر سامنے چلی آتی ہے۔ اس آیت میں جماعت مومنین سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم میں بیس نفوس بھی ایسے نکل آئے جو مستقل مزاج اور ثابت قدم رہے تو وہ فریقِ مقابل کے دو سو آدمیوں پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سو آدمی اس قسم کے نکل آئے تو وہ ہزار آدمیوں کو مغلوب کر لیں گے۔ یعنی ساز و سامان کی برابری کے ساتھ یہ لوگ اپنے سے دس گنا زیادہ جمعیت پر غالب رہیں گے۔ یہ ایک بہت بڑی سبقت (Advantageous Position) ہے جو کسی قوم کو حاصل ہو جائے۔ ایسی قوم ہر میدان سے فاتح و منصور لوٹے گی اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے سے دس گنا زیادہ قوت پر غلبہ پالے گی۔ دنیا کی وہ کونسی قوم ہے جو یہ معلوم کرنا نہ چاہے گی کہ وہ راز کونسا ہے جس کے زور پر وہ فریقِ مقابل کی دس گنا زیادہ جمعیت و قوت پر غالب آجایا کرے۔ قرآن نے اس راز کو پوشیدہ نہیں رکھا اس لئے کہ وہ کتاب مبین ہے یعنی کھلا کھلا ضابطۂ حیات اور تمام نوع انسانی کے لئے واضح رہنمائی (ھدیً للناس وبینت من الھدیٰ) چنانچہ اس نے جہاں یہ بتایا کہ تم اپنے سے دس گنا جمعیت پر غالب آسکتے ہو وہیں یہ بھی بتا دیا کہ اس قوت کا راز کیا ہوگا۔ اس نے کہا کہ تمہارے فریقِ مقابل کی دس گنا زیادہ جمعیت تمہارے ہاتھوں اسلئے شکست کھا جائے گی کہ

بانھم قوم لا یفقھون (۸/۶۵)

اس لئے کہ وہ لوگ فہم و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ محض اندھے جذبات کے جوش میں مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ یہ لوگ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے عقل و بصیرت اور معاملہ فہمی کی رو سے فیصلے نہیں کرتے بلکہ اندھا دھند جذبات کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں اسلئے ایسے لوگوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو یہ ان لوگوں کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے جو اپنے معاملات کا فیصلہ جذبات کے بجائے عقل و بصیرت کی رو سے کرتے ہوں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رو سے کسی قوم کی قوت اور کمزوری کا بنیادی معیار کیا ہے۔ یہ کہ وہ قوم اپنے معاملات کا فیصلہ فہم و بصیرت سے کرتی ہے یا جذبات کے ہیجان سے۔ اس کے بعد یہ سوچئے کہ مسلمانوں کا شمار اول الذکر گروہ (ارباب فہم و فراست) میں ہو سکتا ہے یا ثانی الذکر گروہ میں جن کا ہر قدم جذبات کے سیلاب کے زور سے اٹھتا ہے اور جو آندھی کی طرح ابھر کر آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں آپ دیکھیں گے کہ آج دنیا میں مسلمانوں کی قوم سب سے زیادہ جذباتی واقع ہوئی ہے اور ستم بالائے ستم کہ انھیں اپنی اس شدت

جذبات پر بڑا فخر و ناز ہے۔ وہ اپنے ان جذبات کو ایمان کی حرارت اور حق کی حمایت کا جوش قرار دیکر انھیں اپنا قومی امتیاز سمجھتے ہیں عوام میں اس خیال کے عام کرنے اور ان کی آتش جذبات کو مشتعل رکھنے میں ان کے مفاد پرست رہناؤں کا خاص ہاتھ ہوتا ہے۔ ان لیڈروں کا (جن میں مذہبی پیشواؤں کا قدم سب سے آگے ہوتا ہے) فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ لوگ کبھی عقل و فہم سے کام نہ لیں اور ہمیشہ جذبات کے زور پر بلا سوچے سمجھے وہ کچھ کرتے جائیں جو کچھ وہ ان سے کرانا چاہتے ہیں انھوں نے قوم کو اس کا عادی بنا چھوڑا ہے کہ وہ ان کی ایک دھواں دھار تقریر، ایک آتشیں بیان، ایک فلک بوس نعرے پر عقل و ہوش سے بیگانے ہو جائیں اور اس دیوانگی میں وہ سب کچھ کر گزریں جس پر ان جذبات کے فرو ہونے کے بعد وہ خود ہی نادم و پشیمان ہوں۔ جو لیڈر اپنے پیچھے اس قسم کے لوگوں کو لگا لے اس سے سب ڈرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان سے کمزور حکومت بھی خائف ہو جاتی ہے۔ وہ اس دباؤ میں اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں اور عوام اس حماقت میں تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بلا دریغ جانیں دیدیتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کے خون کی قیمت کون وصول کر رہا ہے۔ آپ (باقی ممالک اسلامیہ کو چھوڑ کر) اگر صرف ہندوستان اور پاکستان کی گذشتہ پچیس تیس سال کی مختلف تاریخوں پر غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ قوم کی اس روش نے (کہ ایک نعرۂ ہُو سے ان کے جذبات آگ کی طرح بھڑک اٹھتے ہیں) ملک کو کسقدر نقصان پہنچایا ہے۔ علاوہ اس مالی اور جانی نقصان کے جس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے، ایک بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ قوم کے اعصاب اس قدر کمزور (بلکہ ذکی الحس) ہو چکے ہیں کہ اب کوئی شخص کسی ایسی بات کے سننے کی تاب نہیں رکھتا جو اس کے جذبات کے خلاف جاتی ہو خواہ وہ بات کتنی ہی معقول اور عقل و دانش پر مبنی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کی حالت ایسی ہو جائے تو اس قوم کے پنپنے کی کونسی شکل باقی رہ سکتی ہے۔

یہ ہے اسوقت ہمارے ملک کی عام حالت جس کے اندر طلوع اسلام یہ دعوت دیتا ہے کہ ہر معاملہ پر قرآن کی روشنی میں عقل و فکر سے غور کرو اور اس کا فیصلہ جذبات کی شعلہ فشانیوں کے بجائے فہم و فراست کی معتدل میزان کی رُو سے کرو۔ بعض حضرات اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ عوام میں طلوع اسلام کی مقبولیت اتنی تیزی سے بڑھ کیوں نہیں رہی۔ اس کا جواب ظاہر ہے۔ جو دعوت عوام کو جذبات کی رو میں بہہ جانے کے بجائے عقل و فکر سے کام لینے کی تلقین کرتی ہو اسے عوام میں کس طرح مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے لیکن طلوع اسلام کے سامنے مقبولیت کا سوال ہی نہیں اس کا مسلک یہ ہے کہ قوم کسی نہ کسی طرح قرآن کی روشنی میں خود سوچنا شروع کر دے۔ وہ خود بھی اسی مسلک پر قائم ہے اور دوسروں کو بھی اسی پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔

یہی ہے وہ مسلک جس کی رو سے وہ آج اس نازک مسئلہ پر دعوت غور و فکر دیتا ہے جس نے اسوقت ملک کی فضا کو ایک شعلہ جوالہ میں تبدیل کر رکھا ہے۔ ہم اپنے قارئین سے اتنی اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کچھ وقت کیلئے جذبات کو الگ رکھ دیں اور ہماری گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ ہمارا مقصد نہ کسی کی طرفداری ہے نہ کسی کی مخالفت۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ قوم کا سنجیدہ طبقہ اس نازک مسئلہ پر دانش و بصیرت سے غور کرے اور فہم و فراست سے اس کا حل سوچے تاکہ ملک ان تباہیوں سے بچ جائے جو جذبات کے سیلاب کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔

ایک دن یکایک خبر آگئی کہ لاہور کی فوجی عدالت نے عبدالستار نیازی صاحب کو موت کی سزا دیدی ہے۔ اور اس کے بعد اس سے

بھی زیادہ اچانک انداز سے اس کا اعلان ہوگیا کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو بھی سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا۔ ان اطلاعات سے ہمارے دل پر کیا گذری اس کے بیان کرنے کی اب ضرورت نہیں اسلئے کہ اس دوسری خبر کے ایک ہی دن بعد یہ خبر کہ یہ سزائیں سزائے قید میں تبدیل کردی گئی ہیں ہمارے اضطراب جگر سوز کو قدرے سکون میں بدلنے کا موجب بن گئی۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مودودی صاحب کے متعلق اس خبر سے ہمیں اسقدر اضطراب کیوں پیدا ہوگیا کیونکہ ہم تو ان کی دعوت اور تحریک کے مسلسل مخالف چلے آرہے ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم آج بھی ان کی تحریک کی اسی طرح مخالفت کرتے ہیں جس طرح اس سے پہلے کرتے رہے ہیں اسلئے کہ (جیسا کہ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں) ہمارے نزدیک ان کی تحریک اسلام اور پاکستان دونوں کیلئے سخت خطرہ کا موجب ہے۔ اس کیلئے ہم اپنے دلائل بارہا بیان کرچکے ہیں جن کے دہرانے کی اس وقت ضرورت نہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہم مودودی صاحب کو نہ دین کا عالم مانتے ہیں نہ کوئی مفکر۔ لیکن ہمارے دل میں انسانی زندگی کیلئے وہ احترام بدرجۂ غایت موجود ہے جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے۔ انسانی زندگی کی یہ قدر و قیمت ہمارے نزدیک ہر قسم کی نسبتوں سے بلند ہے۔ قرآن کی رو سے انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے واجب الاحترام ہے۔ اس کا اعلان یہ ہے کہ "جس نے کسی ایک انسانی زندگی کو بھی ناحق تلف کردیا تو اس کا جرم اتنا بڑا ہے کہ گویا اس نے تمام نوع انسانی کو ہلاک کردیا"۔ لہٰذا یہ بخت ازلی ہے وہ دل جو کسی انسانی زندگی کے ناحق تلف ہوجانے کے احساس سے ہمہ تن اضطراب نہ بن جائے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے طلوع اسلام کو یہ توفیق ارزانی فرمائی ہے کہ وہ احترام انسانیت کے اس بلند جذبہ کو مسلک کے اختلاف سے ملوث نہ ہونے دے۔ الحمد للہ علی ذلک

ہمارا اضطراب یہ تھا کہ اس امر کا یقین ہوجانا چاہئے کہ یہ زندگیاں کہیں ناحق تلف تو نہیں ہو رہیں؟ اور جب یہ اعلان ہوگیا کہ ان کی سزائے موت کو قید میں تبدیل کردیا گیا ہے تو اس سے اتنا اطمینان ہوگیا کہ خیر اب اس کا امکان تو ہے کہ یہ معلوم کرلیا جائے کہ یہ فیصلہ حق پر مبنی ہے یا نہیں۔

قرآن جہاں انسانی زندگی کو اسقدر اہمیت دیتا ہے وہاں اس نے اس حقیقت کو بھی واضح کردیا ہے کہ ایک چیز انسانی زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ ہے عدل۔ ناحق اتلافِ جان کے معنی یہ ہیں کہ وہ جان عدل کے مطابق نہیں لی گئی۔ اس عدل کی رو سے قرآن نے جرم قتل کی سزا موت تجویز کی ہے۔ نیز اس کی رو سے نظام مملکت کے خلاف بغاوت کی سزا بھی قتل یا قید یا جلاوطنی ہے (۵/۳۳)

دنیا کی عام حکومتوں نے بھی قتل اور بغاوت کی یہی سزا تجویز کی ہے۔ بغاوت کی سزا کے متعلق مودودی صاحب اپنی کتاب "مرتد کی سزا" میں لکھتے ہیں:-

> سوال صرف یہ ہے کہ جو ریاست کسی خطۂ زمین پر حاکمیت رکھتی ہو آیا وہ اپنے وجود کی حفاظت کے لئے ایسے افعال کو جرم قرار دینے کا حق رکھتی ہے یا نہیں جو اس کے نظام کو درہم و برہم کرنیوالے ہوں۔ اس پر اگر کوئی معترض ہو تو وہ ہمیں بتائے کہ دنیا میں کب ریاست نے یہ حق استعمال نہیں کیا۔ (ص۵)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> یہ قوانین کسی جذباتی بنیاد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اس اصول پر مبنی ہیں کہ قائم شدہ ریاست جس کے قیام پر ایک خطۂ زمین یعنی سوسائٹی کے

نظم کا قیام منحصر ہو اپنے اجزائے ترکیبی کو انتشار سے بچا رکھنے اور اپنے نظام کو خرابی سے بچانے کیلئے طاقت کے استعمال کا حق رکھتی ہے۔ (ص۶۰)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

دنیا کے جس ملک کا قانون بھی آپ اٹھا کر دیکھیں گے وہاں آپ کو یہی اصول کام کرتا نظر آئیگا کہ ایک اسٹیٹ جن عناصر کے اجتماع سے تعمیر ہوتا ہے ان کو وہ منتشر ہونے سے بزور روکتا ہے اور ہر اس چیز کو طاقت سے دباتا ہے جو اس کے نظام کو درہم برہم کرنے کا رجحان رکھتی ہو۔ (ص۶۵)

بغاوت تو ایک طرف وہ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ

ایک منظم سوسائٹی جو ریاست کی شکل اختیار کر چکی ہو ایسے لوگوں کے لئے اپنے حدودِ عمل میں بمشکل ہی گنجائش نکال سکتی ہے جو بنیادی امور میں اس سے اختلاف رکھتے ہوں۔ (ص۶۹)

اور یہ بھی کہ

جو شخص اس بنیاد کو قبول نہیں کرتا جس پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تنظیم رکھی گئی ہے اور اس سے کبھی آئندہ بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اسے قبول کرے گا۔ ایسے شخص کیلئے مناسب یہ ہے کہ جب وہ اپنے لئے اس بنیاد کو ناقابل قبول پاتا ہے جس پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر ہوئی ہے تو خود اس کے حدود سے نکل جائے۔ مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کیلئے دو ہی علاج ممکن ہیں یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوق شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقعہ دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لا یموت فیہا ولا یحییٰ کی حالت میں مبتلا رہے اور اس صورت میں سوسائٹی کیلئے بھی وہ زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی ذات سے ایک مستقل فتنہ لوگوں کے درمیان پھیلتا رہے گا اور دوسرے صحیح و سالم اعضا میں بھی اس کے زہر کے سرایت کرنے کا اندیشہ ہوگا اسلئے بہتر یہی ہے کہ اسی موت کی سزا دیکر اس کی اور سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے۔ (ص۵۰-۵۱)

ان تصریحات سے ہم صرف یہ بتانا چاہتے تھے کہ جہاں قرآن کی رو سے انسانی زندگی کی اس قدر اہمیت اور قیمت ہے وہاں ایسے جرائم بھی ہیں جن کی پاداش میں بتقاضائے عدل موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اگر یہ سزا عدل کی رو سے ہوگی تو اسے "قتل ناحق" نہیں کہا جائیگا۔ لیکن اگر یہ عدل کے خلاف ہوگی تو یہ "قتل ناحق" قرار پائیگی۔ عام دنیاوی قوانین میں بھی انصاف اور ظلم کا یہی مفہوم ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قانون نے قتل اور بغاوت کی سزا موت (یا کسی جرم کی کوئی سزا) مقرر کی ہے اسی قانون نے یہ بھی متعین کر دیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کیلئے کہ کسی ملزم نے فی الواقعہ وہ جرم کیا ہے یا نہیں کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اس طریق کی تفاصیل کتنی ہی طویل اور مختلف کیوں نہ ہوں، اس کے کم از کم اجزائے لاینفک حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) قانون کی رو سے قائم کردہ عدالت،

(۲) عدالت کی طرف سے الزام کا تعین،

(۳) ملزم کے لئے اپنی مدافعت کا پورا پورا موقعہ اور سہولت۔

(۴) بلا جبر و اکراہ شہادات

(۵) غیر مبہم فیصلہ — اور

(۶) ماتحت عدالت کے فیصلہ کے خلاف اپیل کا حق۔

اگر کوئی فیصلہ ان شرائط و لوازم کے ساتھ صادر ہوتا ہے تو قانون کی رو سے اس فیصلہ کو مبنی بر عدل کہا جائے گا۔ ایسے فیصلہ کے نفاذ میں نہ کسی کی رعایت ہونی چاہئے اور نہ ہی مجرم یا اس کے حمایتیوں کی طرف سے کوئی احتجاج۔ قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ قانون کے نفاذ اور سزا کے اجراء میں کوئی نرمی نہیں ہونی چاہئے۔

عام عدالتوں کی صورت میں چونکہ مقدمات کی کارروائی کھلے طور پر ہوتی ہے اسلئے یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ جرم کے تعین اور فیصلہ میں مندرجہ بالا قانونی شرائط کو ملحوظ رکھا جا رہا ہے یا نہیں، لیکن لاہور میں مارشل لاء کی فوجی عدالت نے جس انداز سے مختلف مقدمات میں فیصلوں کا اعلان کیا ہے ان سے پبلک کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ سزا کے فیصلوں تک پہنچنے کیلئے مندرجہ صدر قانونی تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے یا نہیں۔ چونکہ ہمارے ملک کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ شہری آبادی کے ملزموں کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمات کی کارروائی ہوئی، اس لئے دلوں میں یہ شبہات پیدا ہونے لازمی تھے کہ نہ معلوم فوجی عدالت نے ملزموں کو اپنی صفائی پیش کرنے کے پورے پورے مواقع دیئے ہیں یا نہیں، اور کیا یہ مواقع اُسی نوعیت کے تھے جس نوعیت کے مواقع ملک کی عام عدالتوں میں ملتے ہیں، یا ان کی نوعیت مختلف تھی۔

یہ تھی وہ وجہ جس کی بنا پر نیازی صاحب اور مودودی صاحب کی سزائے موت کی خبریں ہمارے لئے وجۂ صد اضطراب بن گئیں اور صرف ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ پورے ملک کیلئے۔ ہمارے نزدیک ان فیصلوں کا اس طرح بغتۃً (Abruptly) اعلان کرنا غلطی تھی۔ عام عدالتوں میں مقدمات کی کارروائی روز بروز لوگوں کے سامنے آتی جاتی ہے۔ استغاثہ اپنی شہادات اور دلائل پیش کرتا ہے، ملزم اپنی صفائی میں شہادات اور دلائل پیش کرتا ہے۔ الزام اور صفائی کے دونوں پہلو لوگوں کے سامنے آتے جاتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ نفسیاتی طور پر اس کا فیصلہ سننے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد سخت سے سخت سزا فیصلہ بھی ان کیلئے حیران کن اور اضطراب انگیز نہیں ہوتا۔ اضطراب انگیز ہوتا تو ایک طرف بعض مقدمات میں جرم کی سنگینی اور ملزم کی شقاوت اسقدر نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے کہ پبلک خود پکار اٹھتی ہے کہ مجرم کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔

لیکن اس کے برعکس ذرا اس صورت حالات کو ملاحظہ کیجئے کہ ایک دن خبر ملی کہ مودودی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ دوسری خبر یہ آئی کہ انھیں قلعہ سے سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا ہے اور اس کے بعد ایک صبح دفعتہً یہ خبر آگئی کہ انھیں سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا ملک بھر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا ہو سکتا ہے جو اس قسم کی بھیانک خبر کو یوں دفعتہً سنے اور اس کا دل ہمہ تن اضطراب بن جائے؟ فوجی عدالت نے جب ان ملزمین (نیازی صاحب اور مودودی صاحب) کو انتہائی سزا دی ہے تو اس کے بارکرنے کے امکانات ہیں کہ ان سے ضرور کوئی نہ کوئی سنگین جرم سرزد ہوا ہوگا۔ یہ ماننے کو جی ہی نہیں چاہتا کہ ان کا کوئی بھی جرم نہ ہو (یا کوئی خفیف سا جرم ہو) اور انھیں

موت کی سزا دیدی جائے۔ اگر حکومت لوگوں کو ان کے جرم اور مقدمہ کی کارروائی سے مطلع کرتی تو ہو سکتا تھا کہ عوام حکومت کے اس اقدام کو حق بجانب سمجھتے ہوئے اس کی پوری تائید کرتے۔ لیکن حکومت نے اس نفسیاتی تقاضے کو نظر انداز کر کے کتنی بڑی غلطی کی کہ ایک ثانیہ میں پورے کے پورے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کی نگاہوں میں ملزم یکسر معصوم قرار پا گئے اور حکومت جابر و ظالم نظر آنے لگ گئی۔ حکومت کی اس غلطی کے نتائج اس قدر دور رس ہیں کہ اس کا اندازہ اس وقت لگایا ہی نہیں جا سکتا۔

پھر سزائے موت کے اعلان کے چھتیس ۳۶ گھنٹے بعد جبکہ ملک میں چاروں طرف اس کے خلاف ناراضگی کے جذبات ابھر چکے تھے، لاہور سے اعلان ہوا کہ اس سزا کو مبدل بہ سزائے قید کر دیا گیا ہے۔ اس اعلان میں بھی قطعاً یہ نہیں بتایا گیا کہ پہلے کس جرم کی پاداش میں سزائے موت دی گئی تھی اور اب اسے کیوں بدلا گیا ہے۔ اس سے کچھ لوگ تو اس نتیجے پر پہنچے کہ سزائے موت کا فیصلہ یوں ہی اندھا دھند کر دیا گیا تھا اور اب لوگوں کے شور مچانے پر حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اسلئے اس فیصلہ کو بدل دیا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ مودودی صاحب کا جرم کوئی بھی نہیں لیکن حکومت نے اب چودہ سال کی سزائے قید کا اعلان اسلئے کیا ہے تاکہ گورنمنٹ کی سبکی نہ ہو۔ اور بعض لوگوں نے یہ کہا کہ دیکھا ہم نے ذرا سا واویلا مچایا اور حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہ لوگ اب اسی تصور کے ماتحت مودودی صاحب کی غیر مشروط رہائی کے لئے مطالبہ کر رہے ہیں۔

حیرت ہے کہ یہ سب کچھ ہماری اس نئی حکومت کے عہد میں ہوا جس سے ملک کی بڑی خوشگوار توقعات وابستہ ہیں۔ حکومت کو چاہئے تھا کہ وہ مودودی صاحب (اور نیازی صاحب) کے جرائم کی تفصیلات کا اعلان کرتی، پھر یہ بتاتی کہ انھیں اپنی صفائی کا پورا پورا موقعہ دیا گیا تھا۔ ان کی مدافعت یہ تھی۔ جرم یوں ثابت ہوا تھا۔ قانون کی رو سے اس جرم کی سزا یہ ہے۔ لہٰذا اس سزا کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس فیصلہ کے خلاف یوں اپیل ہو سکتی ہے۔ وقس علی ذلک۔ نہ صرف یہ کہ حکومت نے یہ کچھ اس وقت نہیں کیا بلکہ اس باب میں آج تک بھی (جبکہ یہ سطور سپرد قلم کی جا رہی ہیں) حکومت کی طرف سے ایک لفظ باہر نہیں آیا۔ حالانکہ مودودی صاحب کی سزا کے خلاف احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ تو ہوا حکومت کی طرف سے۔ اب دوسری طرف آیئے۔ جماعت اسلامی کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ صالحین کی جماعت ہے۔ ان کا ہر قدم خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق اٹھتا ہے۔ اس جماعت کے سامنے لاہور کی فوجی عدالت نے سینکڑوں مسلمانوں کو پکڑا۔ انھیں اسی طرح سے سزائیں دیں جس طرح بعد میں مودودی صاحب کو سزا دی، حتیٰ کہ مودودی صاحب سے پہلے نیازی صاحب کو سزائے موت تک کا بھی حکم سنایا گیا۔ لیکن اس جماعت میں سے کسی نے اتنا بھی نہیں کہا کہ یہ طریق کار اسلامی آئین کے خلاف ہے۔ اس سے لوگوں کے ساتھ عدل نہیں ہوتا ظلم ہوتا ہے۔ لیکن جونہی ان کے اپنے امیر کے خلاف فیصلہ صادر ہوا چاروں طرف سے شور مچا دیا گیا کہ فوجی عدالت کا یہ فیصلہ اسلام کے آئین عدل کے خلاف ہے، اسلئے مودودی صاحب کی سزا کو برطرف کر کے انھیں رہا کرنا چاہئے۔ یعنی جب وہی کچھ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا تھا تو یہ سب لوگ خاموش بیٹھے تھے لیکن جب وہی کچھ خود ان کے اپنے امیر کے ساتھ ہوا تو حکومت اور اس کی ساری کارروائی خلافِ اسلام قرار پا گئی۔ اب بھی ان کا مطالبہ یہ نہیں کہ مارشل لاء کے تمام قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ ان کا مطالبہ صرف اپنے امیر کی رہائی کا ہے۔

اس کی ایک قانونی صورت یہ ہو سکتی تھی کہ باقاعدہ رحم کی درخواست کی جاتی مگر یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے رحم کی درخواست پیش کرنے میں سب سے بڑا مانع خود مودودی صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ

"ایک اسلامی حکومت میں خلیفہ یا امیر کا یہ منصب نہیں کہ وہ مجرموں کو عدالت کی دی ہوئی سزا سی محض رحم کی بنا پر معاف کر دے (دستوری تجاویز ص۱۵)

لہٰذا رحم کی درخواست کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہاں شاید رائے عامہ کے مظاہرے کے ساتھ رہائی کا مطالبہ ہے۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ ان کا مطالبہ یہ نہیں کہ یہ بتایا جائے کہ مودودی صاحب کا کیا جرم ہے اور انھیں اپنی مدافعت کا موقعہ دیا گیا تھا یا نہیں۔ یہ بھی مطالبہ نہیں کہ ان کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ مطالبہ یہ ہے کہ انھیں فوراً رہا کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مودودی صاحب کا کوئی جرم ثابت ہو چکا ہو اور وہ اپنی بریت ثابت نہ کر سکے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی سنگین الزام ہو لیکن انھیں اپنی مدافعت کا پورا پورا موقعہ نہ مل سکا ہو۔ ان حالات میں مطالبہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے مقدمہ کی تفصیلات شائع کی جائیں۔ اگر اس کے بعد دیکھا جائے کہ اُس میں کوئی قانونی استقام رہ گئے ہیں تو اس کی دوبارہ سماعت کی جائے۔ نہ یہ مطالبہ کہ بلا تفریق اس امر کے کہ وہ مجرم ہیں یا نہیں ہیں، انھیں بہرحال رہا کر دیا جائے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مودودی صاحب مجرم نہیں ہیں اور ان کے خلاف ظلم ہو رہا ہے یا انھیں مدافعت کا حق نہیں دیا گیا تو انھیں یہ حق دلانے کی تائید میں طلوع اسلام پیش پیش ہوگا۔

ایک بات البتہ ایسی ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس مطالبہ کی بنیاد اسلامی جماعت کے اس تصور پر ہے کہ موجودہ حکومت کو حق حاصل نہیں کہ وہ تخریبی قوتوں کے خلاف جبر کا استعمال کرے۔ آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک ایک مملکت کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے تحفظ کیلئے جابرانہ قوت استعمال کر سکے اور جو اجزاء اس کی تخریب پر آمادہ ہوں ان کی آزادی پر پابندیاں عائد کر دے۔ لیکن مودودی صاحب نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ یہ حق ہر ایک مملکت کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

"البتہ یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ جماعتی نظم کے لئے اس تدبیر کو صحیح قرار دینے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر جماعتی نظم کیلئے اس تدبیر کا استعمال برحق ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ بجائے خود صالح ہو یا فاسد۔ یہ حق صرف اس جماعتی نظم کیلئے ہے جو اپنی ذات میں صالح ہو۔ رہا ایک فاسد نظام تو جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں اس کا وجود بجائے خود ایک ظلم ہے، اور اگر وہ اپنے اجزاء کو بٹائے رکھنے کیلئے جابرانہ قوت استعمال کرے تو یہ اس سے زیادہ بڑا ظلم ہوگا۔ (مرتد کی سزا ص۷)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"یہ قاعدہ اپنی جگہ عالمگیر مقبولیت رکھتا ہے کہ ریاست اور حاکمیت کی عین فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ اسے اپنے وجود اور اپنے نظام کی حفاظت کیلئے جبر اور قوت کے استعمال کا حق حاصل ہو۔ یہ حق ریاست من حیث الریاست کا ذاتی حق ہے۔ اور اگر کوئی چیز اس حق کو باطل بنا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو ریاست اس حق سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہو وہ آپ ہی باطل پر قائم ہوئی ہو اسلئے کہ باطل کا وجود بجائے خود ایک جرم ہے اور اگر وہ اپنے قیام و بقا کیلئے طاقت سے کام لیتا ہے تو یہ شدید تر جرم ہو جاتا ہے۔ (ص۶۵-۶۶)

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک صرف ایک صالح نظام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خلاف بغاوت کی کوششوں کو قوت سے دبائے۔ فاسد نظام کو قوت استعمال کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ان حضرات کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ کوئی نظام صرف اس وقت صالح ہو سکتا ہے جب اس کا آئین ان کی تعبیر کے مطابق شرعی ہو۔ چونکہ ابھی تک پاکستان کا نظام شرعی نہیں اس لئے جماعت اسلامی کے تصور کے مطابق موجودہ حکومت کا نظام فاسد ہے اور اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بغاوت کی کوششوں کو دبانے کیلئے قوت کا استعمال کرے۔ ہمارا خیال ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ مطالبہ کہ مودودی صاحب کو فوراً رہا کر دیا جائے اسی بنیاد پر ہے کہ ان کے نزدیک موجودہ حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ تخریبی عناصر کے خلاف قوت کا استعمال کرے۔ اگر ہمارا یہ خیال غلط ہے تو جماعت اسلامی کو چاہیے کہ وہ کھلے کھلے الفاظ میں اعلان کرے کہ ان کے نزدیک

(۱) موجودہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ موجودہ نظام کے خلاف تخریبی قوتوں کو بجبر روک دے ۔ اور

(۲) ان کا یہ مطالبہ کہ مودودی صاحب کو فوراً رہا کر دیا جائے، کس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے؟

اس وقت بہرکیف صورت حالات یہ ہے کہ ایک طرف حکومت خاموش بیٹھی ہے اور لوگوں کو یہ نہیں بتاتی کہ مودودی صاحب کا جرم کیا ہے جس کی پاداش میں انھیں چودہ سال کی سزائے قید دی گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں مودودی صاحب بے گناہ، لہٰذا مظلوم قرار پا رہے ہیں اور حکومت ظالم و جابر سمجھی جا رہی ہے۔ دوسری طرف اسلامی جماعت مودودی صاحب کی غیر مشروط رہائی کے محضر نامے پر لوگوں سے دستخط لئے جا رہی ہے اور کسی کو کھلے کھلے الفاظ میں نہیں بتاتی کہ اس مطالبہ کی بالآخر اسلامی بنیاد کونسی ہے۔

لوگوں سے کہا یہ جاتا ہے کہ مودودی صاحب کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ ملک میں شریعت کا نظام نافذ کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور حکومت طرح طرح کے بہانوں سے انھیں ختم کر دینا چاہتی ہے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کے پاس اس دعوے کی دلیل کیا ہے کہ مودودی صاحب کا کوئی اور جرم نہیں۔ لیکن اس باب میں بھی حکومت کی خاموشی اسلامی جماعت کے اس مطالبہ کی تقویت کا موجب بنتی چلی جا رہی ہے۔

اب دیکھئے ان لوگوں کو جو اس مطالبہ میں اسلامی جماعت کے ہم نوا ہیں۔ ان میں سب سے پہلے خواجہ ناظم الدین صاحب نے بیان دیا کہ مودودی صاحب کو سزائے موت نہیں دی جانی چاہیے اور اس کی دلیل یہ پیش کی کہ مودودی صاحب ایک بہت بڑے عالم دین ہیں۔ ذرا اس دلیل کی معقولیت پر غور فرمائیے۔ انھوں نے اس بات سے بحث ہی نہیں کی کہ مودودی صاحب مجرم ہیں یا نہیں۔ انھوں نے صرف یہ کہا کہ وہ ایک بہت بڑے عالم ہیں، اس لئے انھیں چھوڑ دیا جائے۔ یعنی اگر ایک عالم کسی کو قتل بھی کر دے تو اسے کبھی سزائے موت نہیں دینی چاہیے، کیونکہ وہ بہت بڑا عالم ہے۔

انہی حمایت کرنے والوں میں کچھ حضرات ان اکتیس علماء میں سے بھی ہیں جنھوں نے نظام شریعت مدون فرما کر حکومت کے پاس بھیجا تھا۔ انھوں نے بھی مطالبہ کیا ہے کہ چونکہ مودودی صاحب ایک بہت بڑی دینی شخصیت کے مالک ہیں اس لئے انھیں فوراً رہا کر دیا جائے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے اپنے مسودۂ آئین میں اس کا مطالبہ کیا تھا کہ اور تو اور صدر مملکت پاکستان کو بھی قانون کی رو سے کوئی

امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہونی چاہیئے۔ قانون کی نگاہ میں چھوٹا اور بڑا سب یکساں ہونے چاہئیں۔ ان حضرات نے مارشل لاء کے سینکڑوں غریب سزایافتہ لوگوں کے متعلق تو ایک لفظ تک نہیں کہا لیکن مودودی صاحب کی رہائی کا مطالبہ کر دیا کیونکہ وہ ایک نامور شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ ہے ان حضرات کا اسلام۔

مودودی صاحب کی رہائی کا مطالبہ کراچی کے اٹھارہ مدیران اخبارات و رسائل کی طرف سے بھی پیش ہوا ہے۔ اس مطالبہ کی تمہید میں یہ لکھا ہے کہ

> ہم باشندگان پاکستان اس واقعہ کو ایک حادثۂ فاجعہ قرار دیتے ہیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، ایک جید عالم ہیں اور ایک آئینی جماعت کے لیڈر ہیں انھیں مارشل لاء کے ماتحت گرفتار کر لیا گیا ہے اور فوجی عدالت نے ان پر مقدمہ چلایا اور انھیں سزائے موت دیری جواب چودہ سال کی قید بامشقت کی سزا میں تبدیل کی گئی ہے۔

یعنی اگر لاہور کے سینکڑوں غریب آدمیوں کو جو کسی شہرت کے مالک نہیں تھے۔ جو جاہل تھے، عالم نہیں تھے، جو کسی بڑی جماعت کے لیڈر نہیں تھے، مارشل لاء کے ماتحت گرفتار کیا گیا، ان پر فوجی عدالت نے مقدمہ چلا کر انھیں سخت سزائیں دیں تو ہمارے ان مدیران کرام کے نزدیک یہ سب کچھ کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں تھا۔ لیکن ایک بین الاقوامی شہرت کے مالک، بہت بڑے عالم اور ایک بڑی جماعت کے لیڈر کو اسی طرح گرفتار کر کے سزا دینا قیامت صغریٰ ہے۔

آپ غور کیجئے کہ ہم لوگ جذبات کی رَو میں بہہ کر کیا کچھ کہنے لگ جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صبح و شام، اٹھتے بیٹھتے پکارتے رہتے ہیں کہ قانون کی نگاہ میں تمام افراد انسانیہ یکساں ہونے چاہئیں۔ غریب اور امیر، مشہور اور مجہول، اور لیڈر اور عامی میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن اب یہی حضرات ہیں کہ وہ مودودی صاحب کی رہائی کیلئے دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ ایک متمدن معاشرہ اور سرزمین بے آئین میں فرق یہ ہوتا ہے کہ متمدن معاشرہ میں غریب اور امیر، عوام اور خواص، قانون کی نگاہ میں یکساں ہوتے ہیں۔ لیکن سرزمین بے آئین میں غریبوں کو سزائیں بھگتنی پڑتی ہیں لیکن نامور شخصیتیں قانون کی گرفت سے باہر رہتی ہیں۔ یا تو ان پر کوئی ہاتھ ہی نہیں ڈالتا اور اگر وہ کہیں ماخوذ ہو جاتے ہیں تو انھیں باہر سے دباؤ ڈال کر چھڑا لیا جاتا ہے۔ یہی تھا وہ بنیادی فرق جس کی طرف رسول اللہ صلعم نے اس وقت توجہ دلائی تھی جب ایک نامور قبیلہ کی عورت نے چوری کی اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے سفارش فرمائی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس پر آپ نے سخت غصہ سے فرمایا کہ تم لوگ وہی کچھ کرنے لگے ہو جو ان لوگوں میں ہوتا ہے جہاں قانون کا کوئی احترام نہیں ہوتا۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی کوئی جرم کرے تو میں اسے بھی پوری پوری سزا دوں گا ـــــ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا یہ مطالبہ کہ ایک شخص کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے (بلا تخصیص اس امر کے کہ اس نے جرم کیا ہے یا نہیں) کسی سرزمین بے آئین کی روش ہے یا اس ملک کا مسلک جس میں قانون کا احترام ہوتا ہو۔

ان مدیران کرام کے علاوہ بعض علمائے مصر و شام (اور مفتی اعظم فلسطین) کی طرف سے بھی مطالبہ موصول ہوا ہے کہ مودودی صاحب کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ انھوں نے بھی اس مطالبہ کے لئے کوئی دلیل نہیں دی، نہ شرعی، نہ عام قانونی، مطالبہ

ان حالات کی بنا پر جذبات کی یہ رَو، دن بدن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے جن خطرناک نتائج کا اندیشہ ہو سکتا ہے ان کی صراحت کی ضرورت نہیں۔ جب یہ اور زیادہ بڑھ گئے تو دو صورتوں میں سے ایک بہرحال ناگزیر ہوگی۔ یا تو گورنمنٹ کو اس قسم کے مطالبات کو بجبر روکنا پڑے گا جس کا نتیجہ بہرحال بدامنی ہوگا اور یا گورنمنٹ کو اس دباؤ کے سامنے جھکنا پڑے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک سے قانون کا رہا سہا احترام بھی ختم ہو جائے گا اور یہ خیال ہر شخص کے دل میں تقویت پکڑ جائے گا کہ یہاں جو دباؤ ڈال لے وہی میدان مار لیتا ہے۔

ہمارے نزدیک مسئلہ بڑا آسان اور صاف ہے، بشرطیکہ اسے جذبات سے الگ ہٹ کر اور شخصیتوں اور جماعتوں کی مرعوبیت سے غیر متاثر ہو کر سوچا جائے۔ پنجاب کے گرفتار شدگان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں مارشل لاء کے نافذ ہونے سے پہلے عام شہری قانون کی رو سے گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کے متعلق ہماری حکومت سے یہ درخواست ہے کہ ان کے مقدمات پر (بلا تخصیص دنی و اعلیٰ) نظر ثانی کی جائے اور جو سادہ لوح مسلمان دوسروں کی انگیخت سے قانون شکنی کے مرتکب ہوئے تھے ان کی سزاؤں پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ جو لوگ مارشل لاء کے دوران میں گرفتار کئے گئے تھے ان میں سے کچھ لوگ وہ ہوں گے جو خود مارشل لاء ہی کی کسی شق کی خلاف ورزی کے جرم میں ماخوذ ہوئے ہوں، مثلاً کرفیو کے اوقات میں گھر سے باہر نکل آنا یا صفائی وغیرہ کے سلسلہ میں کسی جرم کا مرتکب ہو جانا۔ ان کی سزاؤں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک کے لوگ اتنے تادیب یافتہ کہاں ہیں کہ وہ ایک ہی دن میں مارشل لاء جیسے سخت گیر قانون کے مقتضیات و عواقب سے واقف ہو جائیں۔ اس کے بعد تیسرا طبقہ ان لوگوں کا رہ جاتا ہے جنہوں نے مارشل لاء سے پہلے یا مارشل لاء کے دوران میں ایسے جرائم کا ارتکاب کیا جو عام شہری قانون کی رو سے بھی سنگین جرائم قرار پاتے ہوں (مثلاً قتل یا بغاوت وغیرہ) ہمیں معلوم نہیں کہ ایسے مقدمات میں فوجی عدالتوں کا طریق کار کیا ہے۔ اگر وہاں ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کی اسی طرح سہولتیں ملتی ہیں جس طرح عام ملکی عدالتوں میں اور مقدمات کے فیصلے بھی اسی انداز سے ہوتے ہیں تو پھر اس باب میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سوائے اس کے کہ اس امر کا اعلان کیا جائے کہ فلاں فلاں ملزم کے خلاف یہ الزام تھا، اسے اس طرح صفائی کا موقعہ دیا گیا، اس کے بعد اس کا جرم ثابت ہوا اور اسے قانون کے مطابق سزا دی گئی۔ اب اس سزا کے خلاف یوں اپیل ہو سکتی ہے یا اس طرح رحم کی درخواست گذرانی جا سکتی ہے۔ اگر اس ضمن میں کوئی تفاصیل ایسی ہوں کہ جن کا اعلان کرنا مملکت کے مفاد کے خلاف ہو تو اس امر کی بھی تصریح کر دی جائے کہ یہ راز کی باتیں ہیں ان کو افشاء نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اگر فوجی عدالت میں مقدمات فیصل کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہاں ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کے پورے پورے مواقع میسر نہیں تھے، تو اس صورت میں ہم بزور درخواست کریں گے کہ ان مقدمات کی سماعت عام عدالتوں میں کی جائے۔

سب سے آخری درخواست یہ ہے کہ حکومت جو کچھ بھی فیصلہ کرے وہ امیر اور غریب، چھوٹے اور بڑے، عالم اور جاہل، لیڈر اور عامی سب کے لئے یکساں ہو۔ اس معاملہ میں اضافی نسبتوں کی بنا پر ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی تفریق کرنا اس فسادِ آدمیت کی بنیاد رکھنا ہے جو ہمیشہ تباہی اور بربادی کا موجب ہوا کرتا ہے۔ ہماری یہی درخواست حکومت سے ہے اور یہی درخواست ان حضرات سے جو ان ملزموں کے لئے ہمدردی کے جذبات اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ ہمارا مطالبہ "ہر فرزندِ آدم" کے لئے یکساں عدل و انصاف کا مطالبہ ہونا چاہیئے نہ کہ خاص خاص شخصیتوں کے لئے کسی امتیازی سلوک کا مطالبہ۔ خدا کی میزان میں ایک گھوسی کی زندگی جس کا اسوقت کوئی نام تک بھی نہیں جانتا اتنی ہی زیادہ قیمتی ہے جتنی کسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لیڈر کی، یا کسی اور مملکت کے وزیرِ اعظم یا بادشاہ کی۔ اسلئے کہ

خونِ شہ رنگین تر از معمار نیست

اور ایک درخواست حکومت سے یہ بھی ہے کہ جتنے لوگ اس تحریک میں مارے گئے یا قید و بند میں گرفتار ہیں، ان کے پسماندگان یا متعلقین کی کفالت کا فوراً انتظام کیا جائے اسلئے کہ اگر مجرم تھے تو وہ لوگ تھے، ان کے یتیم اور غریب بچوں اور بیویوں نے تو کوئی جرم نہیں کیا تھا جس کی پاداش میں انھیں فقر و فاقہ کی مسلسل سزا دی جائے۔ وہ بچے ہمارے اپنے بچے ہیں اور پاکستان کی بننے والی قوم انھیں سے عبارت ہوگی۔

خدا کرے کہ ہماری ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور جو مشورے ہم نے پیش کئے ہیں انھیں جذبات کے شعلوں میں جلا دینے کے بجائے عقل و دانش کی میزان میں تولا جائے۔ اسی میں حکومت، ملک، قوم اور متعلقہ حضرات کی بہبودی اور خیر سگالی ہے۔

نوٹ:۔ ہمیں افسوس ہے کہ بعض ضروری مضامین کی وجہ سے گنجائش نہ ہونے کی بنا پر علامہ تمنا عمادی کا مضمون اعجاز القرآن اس شمارہ میں شامل نہیں ہو سکا آئندہ پرچہ سے وہ سلسلہ پھر جاری کر دیا جائیگا۔

فوری ضرورت ہے

ایک عالمِ دین، فاضل قرآن و حدیث کی جو دعوت و تبلیغ کے ماہر ہوں۔ عمر چالیس پینتالیس سال۔ ملنے سے پہلے بذریعہ خط و کتابت معلومات حاصل کریں۔

پتہ:۔ ایم اے بٹلہ۔ دارالشوریٰ۔ صدر۔ کراچی۔ فون ۳۰۲۲

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں

یوں تو فکری اعتبار سے مجھے طلوع اسلام سے اس کے دور دہلی سے ہی شرف وابستگی حاصل رہا ہے، لیکن دورِ کراچی میں طلوع اسلام سے میرا تعلق "قاب قوسین" کا سا ہو گیا۔ یہ کہتے ہوئے اپنے قلب کو انکسار و مباہات و طمانیت کے مخلوط جذبات سے سرشار پاتا ہوں۔ پرچے کی کتابت اور طباعت سے لیکر اسے آپ احباب کی خدمت تک پہنچانے کے جملہ متنوع مراحل میں سے گزرا ہوں۔ مجھے چونکہ اس درجہ "درونِ خانہ" دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اسلئے چاہتا ہوں کہ بعض ان باتوں کو "قلندرانہ انداز" سے آپ کے گوش گذار کر دوں جو "برون خانہ" گذر جانے والوں کی نگاہوں سے لامحالہ مستور رہتی ہیں۔ طلوع اسلام، دہلی میں بھی اور یہاں کراچی میں بھی، جن حالات میں ہر مہینے شائع ہوتا رہا ہے وہ اس اعتبار سے ایک ہوش ربا داستان ہے کہ مادی اسباب و علل کی اکثر ناگزیر کڑیوں کا اس میں ڈھونڈے سے بھی سراغ نہیں ملتا۔ یہ ہمیشہ اقبال کے اس مصرع کی مجسم تفسیر رہا ہے ــــ خوش آں، اہی کہ سامانے نگیرد! لیکن شاید اسی میں اس کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اسی نے اس کی آہ میں وہ سوز نا کی پیدا کی جو ملت کے سینۂ فکر کی کشود کی ضامن ہوئی، ان حالات کے باوصف یہ اقتاں وخیزاں منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا گیا اور سختی ایام کا شکوہ سنج نہیں ہوا۔ زمانہ گواہ ہے کہ اس کے بادۂ فکر کی تلخی و تندی اور اس کی سینہ ریشی محض اس لئے تھی کہ اس نے اپنی رگ تاک حیات سے اسے کشید کیا اور براہ راست ساغر میں نچوڑا۔ مبدء فیوض کی کرم گستریوں نے اس کے خون جگر میں ایسا بلا کا رنگ بھر دیا تھا کہ یہ نقش دنگار فکر کے لئے کسی خارجی ذریعہ کا دریوزہ گر رنگ نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ان بے شمار مخلصین کو مایوس کیا جو اس کے مسلک سے اس حد تک متمسک تھے کہ انھوں نے اپنی ضروریات میں تخفیف کر کے اس کی استعانت کرنا چاہی۔

طلوع اسلام نے فکر اسلامی کی تشکیل و تدوین نو میں جس انہماک و جانفشانی سے کام کیا وہ آپ سے مخفی نہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج طلوع اسلام کی پیش کردہ دعوت نہ محض پاکستان میں ایک موثر فکری تحریک بن چکی ہے بلکہ اس کا اثر دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی محسوس ہونا شروع ہو گیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

قارئین طلوع اسلام اس امر سے حقیقت سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ اس کی بزمِ فکر میں قرآن کی جو شمع روشن ہے وہ اس ایک مردِ درویش کے فیضان سے ہے جسے زمانہ پرویز کے نام سے جانتا ہے۔ یہ شمع جہاں افروز مسلمانانِ عالم کے ظلمت کدہ میں کب روشن ہوئی اور کس نے روشن کی، یہ ایک جداگانہ داستان ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دورِ حاضر میں اقبال کے بعد اس شمع کی حفاظت پرویز ہی کے حصے میں آئی۔ یہ ان کے غیر معمولی تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہے کہ آج یہ شمع اس قدر روشن ہو چکی ہے کہ یہ اغیار کی پھونکوں سے بجھائے نہیں بجھ سکتی۔ اب تک پرویز اور طلوع اسلام نے اس چراغ کو جلائے رکھا اور وہ جلائے چلے جائیں گے ــــ کہ ان کی زندگی کا مشن یہی ہے

کہ نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن"۔ لیکن اسے انھوں نے کونسی آندھیوں میں جلائے رکھا، اسے وہی جانتے ہیں۔ میں بھی اس کا اندازہ داں ہوں لیکن ہنوز اس داستان کو چھیڑنے کا موقع نہیں۔

آپ ان آندھیوں کی تندی کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے لگائیے جو ۱۹۵۱ء کے آخر میں رونما ہوتے ہوتے رہ گیا۔ آپ اس روح فرسا اعلان کو اب تک نہیں بھولے ہوں گے جو طلوع اسلام نے ۱۹۵۱ء کے پرچے میں شائع کیا تھا، یعنی یہ کہ ناقابل برداشت مالی مجبوریوں کی بنا پر دسمبر ۱۹۵۱ء کے بعد اس کی اشاعت ملتوی کردی جائیگی۔ اس اعلان کا قارئین طلوع اسلام پر جو اضطراری اثر ہوا اس کا ہرچند ہمیں احساس تھا، لیکن ہمیں اسوقت جو خطوط موصول ہوئے انھوں نے ہمیں مجبور کردیا کہ ہم طاقت خلش خار ختم ہو جانے کے باوجود نہ راہ کی پرخاری سے ہراساں ہوں نہ برہنہ پائی سے مایوس، کہ ـــــ بقول اقبال

ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا   کم کر گلۂ برہنہ پائی

بالآخر راستے کے کانٹے ہی عقدہ کشا ہوئے اور طلوع اسلام اپنی منزل کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ یہ اس کی زندگی میں اہم موڑ تھا۔ اس کی زندگی میں دوسرا موڑ گذشتہ سال کے آخر میں آیا۔ یہ موڑ وہ جانفزا اعلان تھا جو محترم پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام میں شائع کرایا، یعنی یہ کہ انھوں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہو جائیں گے اور ہمہ تن اور شبانہ روز اس تحریک کی خدمت میں مصروف و منہمک ہو جائیں گے جس کے نقیب وہ خود اور طلوع اسلام رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تحریک "حسبنا کتاب اللہ" جس کا اعلان عمر فاروق ؓ نے بکمال ژرف نگاہی کیا تھا، اور جو فی الحقیقت عین منشائے قرآن و اسلام ہے، ان دو اعلانات سے ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے۔ اب اس کا دھارا نہ روکا جا سکتا ہے نہ موڑا جا سکتا ہے ولو کرہ الکفرون۔

اس نئے موڑ کے دلکشا اور روح افروز مناظر میں سے چند آپ نے ملاحظہ فرمائے ہیں۔ تھوڑے عرصہ میں طلوع اسلام نے ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو ہماری تحریک کیلئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کتابیں بہرحال مشتے نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے اس بے پناہ ذخیرے کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جو طلوع اسلام یا پرویز صاحب کے نہاں خانۂ قلم میں موجود ہے۔ زمانہ ذرا ساز گار ہو تو ان تمام مجموعوں کو منصۂ شہود پر لایا جا سکتا ہے جس سے انسانی قلب و نظر کے زاویے بدل سکتے ہیں۔ میں ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ یقیناً قارئین طلوع اسلام اسے ایک جانفزا مژدہ سمجھیں گے۔ کہ اسوقت کوئی نصف درجن کتابیں ایسی ہیں جو یا تو مرتب ہو چکی ہیں یا ان کی کتابت ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کی حقیقی افادیت کا پتہ تو اشاعت کے بعد ہی چل سکتا ہے لیکن بعض عنوانات سے اس کا قیاس ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اس میں "سلیم کے نام" خطوط کا مجموعہ بھی ہے جس میں متنوع مسائل اچھوتے اور دلنشین انداز سے بیان کئے گئے ہیں؛ اور "نظام ربوبیت" بھی، جو تحریک قرآن کا بنیادی منشور کا مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ کتب اس سلسلہ پر مستزاد ہیں جو معارف القرآن کے نام سے چل رہا ہے اور جسکی چار جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ اس کی پانچویں جلد کا مسودہ اب تیار ہے۔ اس کا موضوع یہ ہے کہ انسانی زندگی کے حقیقی مسائل کیا ہیں اور کیا ان کا حل تنہا عقل کر سکتی ہے؟ عقل نے ان مسائل حیات کا اپنی ہزاروں سال کی تاریخ میں کیا کیا حل سوچا اور وہ کس حد تک، کہاں اور کیسے ناکام ثابت ہوا؟ اور پھر اگر عقل ان کا حل بتلانے سے قاصر ہے تو عقل کے ماوراء کونسا ذریعہ ہے جو ان کا حل بتا سکتا ہے۔ اس جلد میں جتنا مواد آیا ہے وہ ایک فرد کی محنت سے بہت بالا ہے، لیکن قرآن کے صدقے میں تنہا پرویز یہ جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اور یہ تو سلسلہ معارف القرآن کی پانچویں جلد ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں   ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

لیکن سب پر مستزاد اور میرے نزدیک سب سے اہم قرآن کی وہ لغت ہے جسے یہ قرآن کا شیدائی نئے انداز سے تیار کر رکھا ہے اور اس کے ساتھ قرآن کا وہ ترجمہ جس کی اشاعت سے (میرا یقین ہے کہ) دنیا پھر سے قرآن کو اسی انداز سے سمجھنے لگ جائے گی جس انداز سے وہ اپنے نزول کے بعد پہلی مرتبہ سمجھا گیا تھا اور جس نے دنیائے انسانیت میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔

ان تمام مجموعوں کو آپ تک پہنچانے میں اب تک ایک ہی امر مانع رہا ہے اور وہ ہے سرمائے کی کمی۔ ابتک طلوعِ اسلام جس طرح افتاں وخیزاں چلا جا تا رہا وہ زمانے کے تقاضوں اور ضروریات سے بہت کم ہے۔ اب اس رفتار کو بہت تیز ہو جانا چاہئے کیونکہ انقلاباتِ زمانہ برق رفتاری سے رونما ہو رہے ہیں، اور اگر ہم نے ان کا ساتھ نہ دیا تو ہم زمانے سے پیچھے رہ جائیں گے۔ اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں آچکا ہے اور زیرِ نظر اشاعت کے صفحہ ، پر بھی موجود ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ طلوعِ اسلام آپ سے صرف اتنی معاونت چاہتا ہے کہ آپ ایک سو روپیہ آسان قسطوں میں اسے عنایت کیجئے اور اس طرح اس تمام لٹریچر کو جلد از جلد طبع کرانے میں مدد دیجئے جو قریباً قریباً تیار ہو چکا ہے۔ ہر چند طلوعِ اسلام تجارتی پہلو کو درمیان میں نہیں لاتا کیونکہ اس کا تعلق آپ سے بالکل مختلف بنیادوں پر ہے، تاہم اگر آپ اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے گا تو دو سال میں — ایک سو روپے کے عوض میں — آپ کو انشاء اللہ اتنا ذخیرۂ کتب مل جائیگا کہ آپ کی رقم سے اس کی قیمت بڑھ جائیگی اور آپ خسارے میں نہیں رہیں گے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایسے معاونین کا حلقہ وسیع ہو کیونکہ جتنا حلقہ وسیع ہوگا اتنا ہی کام وسیع ہوگا اور اسی قدر ہر معاون فائدے میں رہے گا۔ آپ اندازہ کیجئے اگر صرف ایک سو ایسے معاون بھی میسر آجائیں تو دس ہزار روپے کی رقم فراہم ہو سکتی ہے۔ یہ رقم چنداں وقیع نہیں لیکن اس سے بہت کام لیا جا سکتا ہے۔

میں یہاں ان احباب کے پہلو میں ایک چٹکی ضرور لینا چاہتا ہوں جو طلوعِ اسلام کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھنے کا شرف رکھتے ہیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ حالات کے کما حقہ علم کے باوجود انھوں نے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں ایک گونہ بے نیازی کا ثبوت دیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ نفسیاتی ہے یعنی یہ کہ وہ طلوعِ اسلام کو اسقدر اپنا سمجھتے ہیں کہ مشکل کے وقت وہ اوروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ وہ آکر مدد کریں۔ اگر میں اس مغالطہ کو دور کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو ہماری بہت سی مشکلات کا حل آسانی سے مل سکتا ہے۔ میں اس تفریق کی معافی چاہتا ہوں کیونکہ فی الحقیقت طلوعِ اسلام کی محفل میں سبھی اپنے ہیں اور کوئی بھی پرایا نہیں۔ لیکن میں یہی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ چونکہ صفِ اول سے لیکر صفِ آخر تک سب کا درجہ ایک ہے اسلئے ہر ایک کو اپنا اپنا فریضہ ادا کرنے میں پہل کرنی چاہئے۔

لہذا آئیے ہم سب مل کر اس دعوت پر لبیک کہیں تا کہ یہ تحریک نئے دور کے بڑھتے ہوئے تقاضے بطریقِ احسن پورے کر سکے۔ اور ہمارے اس پرویز کو جس نے ساری عمر کی جگر کاوی اور سینہ سوزی سے قرآن کے متعلق جتنا کچھ ذخیرہ اپنے ذہن میں جمع کیا ہے وہ منتقل ہو کر کاغذ میں محفوظ ہو جائے اور دوسروں تک پہنچ جائے۔ اسلئے کہ (ڈرتا ڈرتا کہتا ہوں کہ) انسانی عمر کا اعتبار کیا کہ کب ختم ہو جائے۔ ہم اس سے پہلے علامہ اقبال کے سلسلے میں اس کا تجربہ کر چکے ہیں اور آجتک پچھتا رہے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہ اس کے بعد ہمیں دھرا پچھتاوا نہ لگ جائے۔ والسلام

مخلص

خورشید عالم

طاہرہ کے نام .....

طاہرہ بیٹی۔ جیتی رہو۔ جی چاہتا تھا کہ تمہیں یہ "اسیس" دوں کہ دودھوں نہاؤ۔ پوتوں کھلاؤ۔ لیکن اول تو تم یہی پوچھو گی کہ "اسیس" کسے کہتے ہیں۔ اور اگر میں نے یہ بھی بتا دیا کہ "اسیس" محبت بھری دعا کو کہتے ہیں تو تم خود اس دعا کے معنی پوچھنے لگ جاؤ گی۔ اور جس دعا کے معنی پوچھنے پڑ جائیں وہ اپنا اثر و کیف کھو دیتی ہے۔ دعا ہو یا مزاح (HUMOUR) شعر ہو یا نغمہ، یہ اسی صورت میں اثر انداز ہو سکتے ہیں کہ اُدھر کہنے والے کی زبان سے نکلیں اور اِدھر سننے والے کے دل میں اتر جائیں (اسی کو بلیغ کہتے ہیں)۔ اگر ان کا مطلب پوچھنا پڑ جائے تو ان کا سب اثر زائل ہو جاتا ہے۔

بیٹی! تمہارا اگلہ میرے سر آنکھوں پر۔ لیکن میں یہ خیال کرتا تھا کہ جب میں سلیم میاں کو خط لکھ دیتا ہوں تو اس میں تم خود بخود شریک ہو جاتی ہو۔ تم اور سلیم کچھ الگ الگ تھوڑے ہو۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ تمہیں اس کا شدید احساس ہے۔ اس سے مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ بالخصوص تمہارے اس طنز سے کہ میں نے بھی اوروں کی طرح بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دی اور مرد کو عورت سے فائق سمجھا۔ نہیں طاہرہ! تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ یہ چیز تو میرے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن تمہارا طنز تمہارے جذبات کی گہرائی اور احساسات کی شدت کا ترجمان ہے اور اس کا مجھے احترام ہے۔ اس لئے کہ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ جب عورت کے واجب الاحترام جذبات کی قدر نہ کی جائے تو وہ کسقدر "خطرناک" ہو جاتی ہے۔ (دیکھنا بیٹی! اس لفظ "خطرناک" سے کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ میرے الفاظ سے وہی مفہوم لیا کرو جن کے لئے میں انہیں استعمال کرتا ہوں، تمہارے لئے میرے الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لینا چنداں مشکل نہیں، اس لئے کہ تمہیں ان الفاظ کو سنتے سنتے اب ایک عمر گذر گئی ہے)۔ ہمارے معاشرے میں جو ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں ("ہمارے معاشرے" سے مراد ہے تمام مسلمانوں کا معاشرہ) اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں مرد نے عورت کے واجب الاحترام جذبات کی کبھی قدر ہی نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے کبھی عورت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بلکہ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں، اُس نے اِسے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ اسے سمجھا جائے۔ لیکن ایسا سمجھنے سے اس نے کونسا سکھ پا لیا ہے؟ بائیں آنکھ میں آشوب ہو تو دائیں آنکھ کب چین سے سو سکتی ہے!

مروجہ قوانین میں عورت کی حیثیت

تم نے طاہرہ! اپنے ذہن میں اس مسئلے کو بڑی آسانی سے حل کر لیا کہ چونکہ ہمارے قوانین شریعت "مردوں کے بنائے ہوئے ہیں اس لئے ان میں مردوں کو ہر حال میں بالادست رکھا گیا ہے اور عورت بچاری کو کچل دیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے موجودہ قوانینِ شریعت (یا رسم و رواج) کا نتیجہ وہی ہے جو تم نے بیان کیا ہے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں جو تم نے سمجھی ہے۔ اگر اس توجیہ کو صحیح سمجھ لیا جائے تو اس کے

معنی یہ ہوں گے کہ مردوں کی "فطرت" ہی ایسی ہے کہ یہ اپنے آپ کو بالادست رکھنا چاہتے ہیں اور عورت کو اپنا محکوم و مغلوب۔ نہیں یاد ہوگا کہ میں نے سلیم کے نام ایک خط میں اس حقیقت کو واضح کیا تھا کہ "انسان کی فطرت" کوئی چیز نہیں۔ اس میں کچھ رجحانات (امیال و عواطف) وہ ہیں جنھیں یہ اپنی حیوانی زندگی سے اپنے ساتھ لایا ہے۔ جہاں تک حیوانات کا تعلق ہے، ان میں یہ جذبہ کہیں کارفرما نظر نہیں آتا کہ نر اپنی مادہ کو اپنا زیردست رکھنا چاہے۔ لہٰذا مردوں میں یہ جذبہ حیوانی جبلت کا نتیجہ تو ہو نہیں سکتا۔ حیوانی جبلت کے علاوہ، جن خصوصیات کو "انسانی فطرت" کہا جاتا ہے وہ درحقیقت وراثت، ماحول، تعلیم اور تربیت وغیرہ کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ چونکہ ہمارے مروجہ قوانین مردوں نے بنائے تھے اس لئے ان میں عورت کو اس درجہ پست حیثیت دی گئی ہے۔ اس کے بجائے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چونکہ یہ قوانین اس ماحول میں بنے تھے جس میں عدل کے بجائے استبداد کا دور دورہ تھا اور عورت کو بنگاہِ نفرت دیکھا جاتا تھا، اسلئے ان قوانین و تصورات کی رُو سے عورت کی حیثیت، مغلوب و مقہور اور ذلیل و حقیر سی قرار پاگئی۔ یہ قوانین، ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہیں (اور جیسا کہ میں کئی مرتبہ بتا چکا ہوں، ہمارا مروجہ "اسلام" کم و بیش اسی دور کا مرتب شدہ ہے)۔ تم دیکھو گی کہ اس دور میں زندگی کا جو نقشہ مرتب ہوا (خواہ وہ عورتوں سے متعلق تھا یا مردوں سے) اس میں ہر مقام پر استبداد کا پہلو نمایاں تھا۔ مثلاً جو قوانین اس دور میں مرتب ہوئے ان کی رو سے، جملہ حقوق، حکمران طبقے کے حق میں ڈھلے ہیں، رعایا کے کوئی حقوق نہیں۔ رعایا صرف "عنایاتِ خسروانہ" کی بھیک مانگ سکتی ہے، کوئی چیز بطور استحقاق طلب نہیں کر سکتی۔ ان قوانین کی رو سے، تمام حقوق زمیندار کو حاصل ہوتے ہیں۔ کاشتکار کو جو کچھ ملتا ہے، ایک خدمتگار (کمی) کی حیثیت سے ملتا ہے۔ ان کی رُو سے، امیر آدمی عیش و عشرت کے تمام سامان جب جی چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ غریب کو روٹی تک بھی خیرات کے طور پر ملتی ہے۔ غرضیکہ ان قوانین کی رو سے

ملا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش "تجمل حسین خاں" کے لئے
(ورنہ)

حتیٰ کہ ان تصورات کی رُو سے، امیر آدمی جنت تک بھی روپے کے عوض خرید سکتا ہے۔ لیکن غریب بچارے کو اپنی نجات خدا سے رو رو کر مانگنی پڑتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس ماحول میں، زیردست مردوں کے متعلق اس قسم کے قوانین و نظریات و تصورات وضع ہوئے ہوں، اس میں عورت بچاری کے لئے کسی بہتر سلوک کی توقع کس طرح کی جا سکتی تھی؟

عیسائیت کا اثر

عورت کے معاملے میں تو استبداد کے علاوہ مردوں کے دل میں نفرت اور حقارت کے جذبات بھی موجزن تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ بھی، جیسا کہ میں متعدد بار لکھ چکا ہوں، ہمارا مروجہ اسلام، یہودیوں کی رسوم پرستی، مجوسیوں (ایرانیوں) کی اشخاص اور نسل پرستی اور عیسائیوں کی خانقاہیت کا مرقع ہے۔ عیسائیوں کی رہبانیت میں عورت کے متعلق بڑا گھناؤنا تصور تھا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عورت تمام گناہوں کا سرچشمہ ہے کیونکہ آدم بچارے کو جنت سے نکلوانے کا

موجب یہی تھی۔ اسے ابلیس کا پیکر سمجھا جاتا تھا کیونکہ دنیا میں شر کا وجود اسی سے باقی تھا۔ اسلئے عیسائیت میں عورت تمام برائیوں کا مجسمہ، فلہذا سخت قابلِ نفرت شے سمجھی جاتی تھی۔ اس تصور کی تہ میں جذبہ یہ کارفرما تھا کہ حضرت عیسیٰ کی تجرد (بلا بیوی بچوں) کی زندگی کو شرفِ انسانیت کا نمونہ قرار دیا جائے۔ عیسائیوں کے ہاں تو یہاں تک بھی کہدیا گیا تھا کہ عورت میں روح ہی نہیں ہوتی۔

اس سے مجھے ایک دلچسپ بات یاد آ گئی۔ ہمارے گاؤں میں ایک حکیم تھا، پریم سنگھ۔ ڈنگروں کا ڈاکٹر بھی وہی تھا اور انسانوں کا طبیب بھی وہی۔ ایک دفعہ والدہ کو درد گردہ کی تکلیف ہوئی، انھوں نے پریم سنگھ سے کہا کہ میرے گردے میں درد ہے اس کے لئے کوئی دوائی دو۔ اس نے کہا کہ نہیں آپ کو گردے کا درد نہیں۔ والدہ کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ درد گردہ ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے اصرار سے کہا کہ یہ درد گردہ ہی ہے۔ اس پر حکیم پریم سنگھ نے کہا کہ نہیں پھوپھی! آپ کو درد گردہ نہیں۔ عورت کے تو گردہ ہوتا ہی نہیں ("دل گردے" والے صرف مرد ہوتے ہیں)۔ والدہ اس "حکیم" سے اور کیا کہتیں۔ اتنا ہی کہا کہ پریم سنگھ! محمد دین قصائی کے ہاں ہر روز بکری ذبح ہوتی ہے۔ اس میں سے اسی طرح دو گردے نکلتے ہیں جس طرح بکرے سے۔ پریم سنگھ نے کہا کہ پھوپھی! بکری کی اور بات ہے۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ عیسائیت کا یہ تصور کہ عورت سخت قابلِ نفرت شے ہے، مسلمانوں میں بھی منتقل ہو کر آ گیا۔ اور یہ اسی معاشرے میں ہوا جس کے استبداد کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ ہمارے "اسلامی تمدن" کا وہ دور تھا جس میں عورتیں بازاروں میں نیلام ہوا کرتی تھیں (رنڈی کے بازاروں میں اب بھی ایسا ہوتا ہے کیونکہ وہاں "خدا کے فضل سے" "حکومت" اسلامی شریعت" کے مطابق ہے اور حضور جلالۃ الملک "سنتِ رسول اللہ" کے زندہ کرنے والے "محی السنۃ" ہیں)۔ عورتیں بازاروں میں فروخت ہوتی تھیں اور ہر شخص کو اجازت تھی کہ جتنی جی چاہے خرید لے اور جب جی چاہے انھیں فروخت کر دے۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں اس "شریعت" کے قوانین مدون ہوئے جسے آج کل اسلام کہا جاتا ہے۔ ان قوانین میں احترامِ آدمیت کے آثار و نقوش ڈھونڈنا اور عورت کے صحیح مقام کی تلاش کرنا، اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ ان قوانین کی تائید و جواز میں اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔ یہ آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی اس لئے یہ پسلی کی ہڈی کی طرح ہمیشہ ٹیڑھی رہے گی۔ اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ جس قوم کے معاملات میں عورت کی رائے کو عمل دخل ہوگا وہ قوم تباہ ہو جائے گی۔ وغیر ذالک۔

ہمارا ضابطۂ اخلاق ان قوانین و تصورات کی روشنی میں جب ہمارا ضابطۂ اخلاق مرتب ہوا تو اس میں عورت کے متعلق اس قسم کی لغویات کو مسلمات کی حیثیت سے داخل کر دیا گیا کہ

اگر نیک بودے سرا حوالِ زن زناں را مزن نام بودے نہ زن

(اگر عورت کی سرشت نیک ہوتی تو اس کا نام زن (مارو) نہ ہوتا، مزن (مت مارو) ہوتا۔)

چہ خوش گفت جمشید با رائے زن کہ با پردہ یا گور بہ جائے زن

(جمشید نے اپنے مصاحب سے کیسی اچھی بات کہی کہ عورت کا بہترین مقام یا پردہ ہے یا گور)

مشو ایمن از زن کہ زن پارسا ست کہ خربستہ بہ گرچہ دزد آشنا ست

(اگر عورت پارسا ہو تو بھی اس کی طرف سے مطمئن نہ رہو۔ کیونکہ اپنے گدھے کو باندھ کر ہی رکھنا چاہئے خواہ چور کیسا ہی دوست کیوں نہ ہو۔)

اگر تم اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کچھ سننا چاہتی ہو تو ہیر وارث شاہ کو دیکھو (جو پنجاب کے معاشرہ کا عکس ہے اور جسے قرآن کی طرح سند میں پیش کیا جاتا ہے) میں نہیں اس کے کچھ متعلقہ اشعار لکھ کر بھیجتا لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر میں فارسی کا کوئی شعر لکھوں تو اس کا ترجمہ کروں اور اگر تمہاری اپنی زبان میں کچھ کہوں تو اس کا مطلب سمجھاؤں۔ میں تو سمجھ ہی نہیں سکا کہ تم نئی پود کے بچے اسکولوں اور کالجوں سے کیا بن کر نکلتے ہو؟ اپنی زبان بھول جاتے ہو اور کوئی دوسری زبان اس انداز سے سیکھ نہیں پاتے کہ اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکو۔ تمہارے دور کے بچے تو خیر پھر بھی کسی حد تک غنیمت تھے۔ آنے والی نسل کے متعلق تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا بن رہی ہے۔ لیکن میں بھولا! تم اور تمہارے ساتھ کے بچے بھی وہی کچھ بن کر نکلے تھے جو ہم نے انھیں بنایا تھا اور اب یہ آنے والے بچے بھی وہ کچھ بن کر نکلیں گے جو کچھ ہم انھیں بنا رہے ہیں۔ اس میں نہ تمہارا قصور ہے نہ ان آنے والے بچوں کا۔ بچوں کو تو جو کچھ بنایا جائے وہ وہی کچھ بن جاتے ہیں۔ فرعون بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا کرتا تھا لیکن لڑکیوں کو تو زندہ رکھتا تھا۔ لیکن ہمارے ہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں زندگی سے محروم رہتے ہیں۔

وارث شاہ کے معاملے میں دوسری مشکل یہ بھی ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو وہ سب کچھ سنا بھی نہیں سکتا جو اس نے لکھا ہے عورت کے متعلق اس نے نرم ترین الفاظ میں بھی جو لکھا ہے وہ یہ ہے کہ "ایہہ ترینوتاں مکر دیاں کنیاں نیں" یعنی عورتیں مکر و فریب کی کنیاں ہوتی ہیں۔ یہ لفظ ذرا تشریح طلب ہے۔ سورۂ یوسف میں زلیخا کے خاوند کا قول مذکور ہے کہ ان کیدکن عظیم (ان عورتوں کی چال بڑی گہری ہے)۔ لیکن ہمارے ہاں اس قول کو اس طرح پیش کر دیا جاتا ہے گویا یہ خود خدا کا ارشاد ہے۔ کہیں عورت کے متعلق بات چھڑی اور ایک طرف سے جھٹ سے آواز آ گئی کہ میاں ان کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں خود اللہ میاں نے کہہ دیا ہے کہ ان کیدکن عظیم۔ اس کے بعد کونسی سند کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے! وارث شاہ نے بھی اسی "ارشاد خداوندی" کے تتبع میں فرما دیا کہ عورتیں "مکر دیاں کنیاں" ہوتی ہیں۔ لفظ "کنیاں" میں ایک تو "کیدکن" کے لفظ "کن" کا تلازمہ ہے۔ لیکن اس لفظ کے معنی بڑے جامع ہیں۔ تم نے گاؤں میں آک (مدار) کا بوٹا دیکھا تھا۔ اس میں آم کی شکل کا "پھل" بھی دیکھا تھا۔ اسے "آک کی کُنی" کہتے ہیں۔ شکل و شباہت کے اعتبار سے بالکل آم، لیکن سارا زہر سے بھرا ہوا۔ زبان سے لگ جائے تو حلق تک کڑوا ہو جائے۔ آنکھوں میں پڑ جائے تو آنکھیں اندھی ہو جائیں۔ یہ ہے "کُنی"۔ اس سے سمجھ لو کہ "مکر کی کنی" کے کیا معنی ہوئے۔ یہ ہے ہمارے معاشرے میں عورت کی تصویر، شکل ثمر بہشت کی اور خاصیت زہر کی۔

یہ تو خیر وارث شاہ کی باتیں ہیں جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ معاشرہ کے سطحی طبقہ کا ترجمان ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ عورت کے ناقص العقل، بے وقوف، جاہل ہونے کی سند میں اعداد و شمار تک پیش کر دیتے ہیں۔ یعنی پہلے تو عورت کو قرنہا قرن سے جہالت کی کوٹھڑیوں میں بند رکھا اور اس کے بعد اس کی جہالت کو اپنے اس دعوے کے

ثبوت میں بطورِ سند پیش کردیا کہ عورت ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ یعنی پہلے تو چینی لڑکیوں کے (بچپن ہی سے) پاؤں تو زندگی کا کوئی اور جب اس طرح ان کے پاؤں چھوٹے چھوٹے رہ گئے تو انھیں بطورِ شہادت پیش کردیا کہ چین کی عورتیں چلنے کے قابل ہی نہیں۔ (مرد)

عورت اور قرآن

یہ کچھ تو ظاہرہ! عورت کے ساتھ ان قوانین وضوابطِ اخلاق نے کیا جو اس دَور کی پیداوار تھے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن ایک مسلمان کے لئے، عورت (یا مرد) کا صحیح مقام متعین کرنے کا معیار نہ تو یہ قوانینِ معاشرت ہیں اور نہ ہی یہ ضوابطِ اخلاق۔ اس کے نزدیک، اس آسمان کے نیچے، معیار فقط ایک ہی ہے اور وہ ہے اس کے خدا کی کتاب جس پر ایمان لانے کا وہ دعویدار ہے۔ قرآن نے عورت کو کونسا مقام دیا ہے، اس کی تفاصیل تو طویل ہیں لیکن ان کا ماحصل کیا ہے؟ اس کے متعلق علامہ اقبالؒ کا ایک لطیفہ یاد آگیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میں مسلمان نہ ہوتا اور قرآن کا ویسے ہی مطالعہ کرتا تو میں اس نتیجہ پر پہنچتا کہ یہ کتاب کسی عورت کی تصنیف ہے جس نے مردوں سے اپنی صنف کے غصب کردہ حقوق کا بدلہ لیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب، ایک طرف یہ دیکھا جائے کہ دنیا کے مختلف مذاہب اور تہاذیب میں عورت کو کن پستیوں میں دھکیلا گیا ہے اور دوسری طرف قرآن کو دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس میں عورت کی طرفداری کی گئی ہے۔

قرآن نے سب سے پہلے اس عام تصور کی تردید کی کہ خدا نے پہلے مرد (آدم) کو پیدا کیا تھا اور اس کی پسلی سے عورت (حوا) کو نکالا تھا۔ یہ تو تم سمجھ ہی چکی ہو کہ قرآن کی رو سے یہ تصور ہی غلط ہے کہ انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ کسی خاص جوڑے (آدم) اور (حوا) سے شروع ہوا تھا۔ قرآن میں آدم کو نوعِ انسانی کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ (یہ ایک الگ بحث ہے کہ انسان کے درجے میں پہنچکر کچھ ایسی خصوصیات کا اضافہ کیا گیا جو حیوانی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہیں۔ تم اس بحث کو معارف القرآن کی دوسری جلد میں دیکھ چکی ہو) نظریۂ ارتقاء کی رو سے زندگی کی ابتداء ایک خلیۂ حیات (LIFE CELL) سے ہوتی ہے جو آگے چل کر خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ ایک (OVUM) یعنی مادہ کا خلیہ، اور دوسرا (SPERMATAZOON) یعنی نر کا خلیہ۔ قرآن میں بھی یہی بتایا گیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ (اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا)۔ وجعل منھا زوجھا (اور اس جرثومۂ حیات سے اس کا جوڑا بنایا) یعنی وہ جرثومۂ حیات دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ اور پھر ان دونوں خلیوں کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلادی۔ (وبث منھما رجالا کثیرا ونساء ۴/۱) اس سے تم نے دیکھ لیا کہ قرآن کی رُو سے مرد اور عورت میں پیدائش کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت یا سبقت حاصل نہیں دونوں کا سرچشمۂ حیات ایک ہے اور دونوں ایک ہی اصل کی دو شاخیں ہیں۔

قرآن نے جہاں مرد اور عورت کو زوج کہا ہے تو یہ نہیں کہا کہ عورت کو مرد کی زوج بنایا۔ بلکہ انسانوں کو خطاب کرکے کہا کہ جعل لکم من انفسکم ازواجا (۴۲/۱۱) اس نے تم میں سے تمہارے لئے زوج بنادیئے۔ زوج کہتے ہیں رفیق اور ساتھی کو۔ یعنی مرد اور عورت ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ خصوصیت صرف انسانوں ہی میں نہیں۔ ہم نے کائنات کی ہر شے میں

ایک کا ساتھی دوسرے کو بنایا ہے (ومن کل شیٔ خلقنا زوجین ۔ ۵۱/۴۹) جو کچھ زمین سے اگایا ہے اس کے بھی زوج اور اسی طرح انسانوں کے بھی (خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم ومما لا یعلمون ۳۶/۳۶) دن اور رات، روشنی اور اندھیرا۔ سردی اور گرمی۔ ایک دوسرے کے نقیض نہیں بلکہ زوج ہیں۔ یعنی ایک کی تکمیل دوسرے کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے زوج کے معنی ہوں گے (COMPLEMENTARY)۔ مرد کی تکمیل عورت سے اور عورت کی تکمیل مرد سے ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ (بعضکم من بعض ۴/۲۵) "تم ایک دوسرے میں سے ہو" اس لئے تم میں سے کوئی بھی اکیلا مکمل نہیں ہے۔ اسی لئے قرآن نے انسان کے لئے "نسب اور سسرال" دونوں رشتوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ (ھو الذی خلق من الماء بشرا فجعلہ نسبا وّ صھرا ۔ ۲۵/۵۴)

اس کے بعد قرآن نے اس تصور کی تردید کی کہ "جنت میں آدم کی لغزش کا موجب عورت ہوئی تھی" یعنی (اس تصور کی تردید کہ) ابلیس نے عورت کو اپنے پھندے میں پھنسایا اور پھر عورت نے آدم کو بہکایا جس کی وجہ سے وہ گناہ کا مرتکب ہوا اور جنت سے نکالا گیا۔ قرآن نے کہا کہ مرد اور عورت دونوں میں یکساں طور پر قانون کی پابندی اور قانون شکنی کی صلاحیت موجود ہے۔ غلط فیصلوں کا امکان دونوں سے ہے اور دونوں لغزش کھا سکتے ہیں۔ (فازلھما الشیطان عنھا)۔ اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ دنیا میں گناہ کی ذمہ دار عورت ہے۔ مرد بالکل معصوم ہے۔

مرد اور عورت دونوں واجب التکریم

یہ تو رہا منفی کا پہلو۔ مثبت کی طرف قرآن نے کہا ہے کہ ولقد کرمنا بنی ادم۔ "ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔" اس سے مراد صرف مرد نہیں، مرد و عورت دونوں ہیں۔ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب مرد اور عورت دونوں کا مشترکہ ذکر ہو تو "بنو فلاں" کہتے ہیں۔ قرآن میں "بنی اسرائیل" سے مراد قوم بنی اسرائیل کے صرف مرد ہی نہیں، مرد اور عورت سب ہیں۔ اسی طرح جب قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے انسان کو "فی احسن تقویم" پیدا کیا ہے۔ یعنی حسن کارانہ توازن کو لئے ہوئے۔ تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن کا "مخاطب" انسان" سے ہوتا ہے۔ صرف مردوں سے نہیں۔

یہیں سے لگے ہاتھوں تم اس نکتہ کو بھی سمجھ لو کہ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ (i) انسان کی صلاحیتوں کو نشوونما دے کر ان میں توازن پیدا کیا جائے۔ (ii) اس معاشرے میں توازن پیدا کیا جائے جس میں ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور (iii) انسان اور کائنات کی قوتوں میں توازن پیدا کیا جائے۔ یعنی انسانی زندگی کا سارا مقصود قیامِ توازن ہے۔ اب تم یہ سوچو کہ جب (قرآن کی رُو سے) انسانی زندگی سے مراد مرد اور عورت دونوں کی زندگی ہے، تو کیا یہ کسی صورت میں بھی ممکن ہے کہ یہ توازن صرف ایک صنف (تمام مردوں یا عورتوں) کے ذریعے سے پیدا ہو سکے۔ کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ الانسان (THE MAN) کے آدھے حصے کو یکسر نظرانداز کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ انسانیت میں توازن پیدا ہو جائے گا؟ انسانی معاشرہ میں جو ناہمواریاں ہمیں نظر آ رہی

ہیں، ان کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان نے اپنے "آدھے حصے" ہی کو پورا انسان سمجھ رکھا ہے جس سے نہ تو زندگی کا کوئی مکمل نقشہ بنتا ہے اور نہ ہی اسے توازن نصیب ہوتا ہے[1]۔ بلکہ اس کی حماقت تو اس سے بھی آگے بڑھتی ہے۔ یعنی جس "آدھے حصے" (مرد) کو اس نے "الانسان" سمجھ رکھا ہے اس میں بھی اسقدر طبقاتی تقسیم کر دی ہے کہ اس کے (شاید) ننانویں فی صدی حصے کو "الانسان" کی صف سے الگ کر رکھا ہے اور "انسان" تصور کر لیا گیا ہے۔ فقط اس قلیل سے حصے کو جسے اس نے اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق "اوپر کا طبقہ" قرار دے رکھا ہے۔ اس میں نہ فکرِ انسانی کے نمائندے (کسی افلاطون) کی تخصیص ہے اور نہ ہی مذہبی دنیا کے ترجمان (کسی براہمن) کی تمیز۔ سب کے ہاں طبقاتی تقسیم موجود ہے۔ (لیکن یہ موضوع تمہارے استفسار سے باہر کی چیز ہے اس لئے اس خط میں اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں)۔

تقسیمِ کار کا اصول

اب تم یہ دیکھو طاہرہ! کہ قرآن اس توازن کے لئے (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کیا نقشہ بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم کائنات میں غور کرو۔ ہر جگہ تقسیمِ کار کا اصول نظر آئے گا۔ سورج کا کام حرارت پہنچانا ہے پانی کا کام ٹھنڈک اور نمی دینا۔ ہوا اپنی خصوصیات الگ رکھتی ہے اور مٹی کی خصوصیات الگ ہیں۔ لیکن بیج کی نشوونما ان سب مختلف اور متفرق قوتوں کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ اس امتزاج میں ہر قوت کا اپنا اپنا حصہ ہے اور اپنا اپنا فریضہ۔ اس تقسیمِ کار میں کسی ایک قوت کو دوسری قوت پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ آگ کو پانی پر اس لئے فضیلت حاصل نہیں کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے اور پانی ٹھنڈک۔ نہ ہی پانی کو آگ پر اس وجہ سے کوئی فوقیت حاصل ہے کہ وہ ٹھنڈک پہنچاتا ہے اور آگ حرارت۔ پانی اور آگ کی الگ الگ خصوصیات ہیں اور نظامِ کائنات میں توازن رکھنے کے لئے ان دونوں کی ضرورت ہے، اور اپنا اپنا مقام۔ ان کے باہمی امتزاج سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو کمی ایک عنصر میں ہے وہ دوسرا عنصر پوری کر دے۔ یعنی بیج کی نشوونما کے لئے حرارت کے علاوہ ٹھنڈک اور نمی کی بھی ضرورت تھی۔ چونکہ سورج کی کرنوں میں اس کی کمی تھی اس لئے پانی نے اسے پورا کر دیا۔ اسی طرح پانی میں حرارت کی کمی تھی اس کی اس کمی کو سورج نے پورا کر دیا۔ لہٰذا ان دونوں کی رفاقت سے مقصود یہ ہے کہ ایک کی کمی دوسرے کے تعاون سے پوری ہو جائے۔ یہ ہے ان کا صحیح صحیح مقام۔ لیکن اگر ان میں سے (مثلاً) حرارت یہ سمجھ لے کہ میں پانی سے افضل ہوں کیونکہ میں وہ کام کر سکتی ہوں جو پانی نہیں کر سکتا تو یہ اس کی حماقت ہے۔ ابلیس کی یہی غلط فہمی تھی جس کی بنا پر اس نے کہا تھا کہ میرا مقام اس لئے آدم سے بلند ہے کہ میری پیدائش نار (آگ) سے ہوئی ہے اور آدم کی طین (مٹی) سے[2]۔ (خلقتنی من نار و خلقتہ من طین) اس کی اس دلیل کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے کہ کائنات میں یہ مختلف و متفرق قوتیں ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے والی ہیں۔ ایک کو اگر ایک شعبے میں افضلیت حاصل ہے تو دوسری کو دوسرے میں۔ لہٰذا یہ ایک دوسرے کی (COMPLEMENTARY) ہیں۔ یعنی ایک دوسرے

---

[1] اس اجمال کی تفصیل خط کے آخری حصے میں ملے گی۔

[2] ابلیس کیا ہے؟ شیطان کسے کہتے ہیں؟ یہ تمام امور معارف القرآن کی دوسری جلد میں بیان کئے جا چکے ہیں۔

کی کمی کو پورا کرنے والی۔

جو کچھ خارجی کائنات میں ہو رہا ہے وہی کچھ انسانی معاشرہ میں مقصود ہے۔ یہاں بھی تقسیمِ عمل کا اصول کارفرما ہے۔ انسانی دنیا میں مرد اور عورت دو ہی مختلف عناصر ہیں۔ ان میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں لیکن کچھ خصوصیات ایسی بھی ہیں جو ایک میں ہیں اور دوسرے میں نہیں۔ قانونِ کائنات کے مطابق یہاں بھی ایک کی خصوصیات کی کمی، دوسرے کی رفاقت سے پوری ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ایک صنف کو دوسری صنف پر فضیلت حاصل ہے۔ (فضلنا بعضکم علی بعض) یعنی اگر ایک خصوصیت کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے تو دوسری خصوصیت کے لحاظ سے عورتوں کو مردوں پر فوقیت ہے۔ ان میں سے کسی ایک صنف (مرد یا عورت) کا یہ سمجھ لینا کہ چونکہ مجھ میں ایک ایسی خصوصیت ہے جو صنفِ مقابل میں نہیں، اس لئے میں اس سے افضل ہوں، غلط بینی پر مبنی ہے۔ صحیح زاویۂ نگاہ یہ ہونا چاہیئے کہ مجھ میں ایک ایسی کمی ہے جو صنفِ مقابل کی رفاقت سے پوری ہو سکتی ہے۔ یعنی میری تکمیل کے لئے اس کی رفاقت (تزویج) لابدی ہے۔ اس لئے میں اس سے افضل نہیں ہوں بلکہ اپنی تکمیل کے لئے اس کی "زوجیت" (رفاقت) کا محتاج ہوں۔ اسی بنا پر قرآن نے مرد اور عورت کے باہمی تعلق کی نسبت فرمایا کہ جعل بینکم مودۃ و رحمۃ (۳۰/۲۱) اللہ نے تم میں باہمی مودت اور رحمت پیدا کی ہے۔ اس میں مودت اور رحمت کے الفاظ غور طلب ہیں۔ مودت کے عام معنی تو کشش و محبت کے ہیں لیکن وَدٌّ کہتے ہیں اس میخ کو جس سے دو چیزیں آپس میں اس طرح جڑ جائیں کہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بن جائے۔ اسی بنا پر کسی شے کی صلاحیتوں کے کامل مظاہرے کو مودۃ کہتے ہیں۔ ودود اس گھوڑی کو کہتے ہیں جو دوڑنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دے۔ مرد اور عورت کے اس طرح باہم گرویدہ ہو جانے کے لئے قرآن نے دوسری جگہ انھیں لباس سے تشبیہ دی ہے جہاں فرمایا کہ ھن لباس لکم وانتم لباس لھن۔ تم ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ لباس کے ہو جس کا بدن کے ساتھ پورا پورا اختلاط ہوتا ہے۔

دوسرا لفظ رحمت ہے جس کے معنی سامان و اندازِ ربوبیت کے ہیں۔ (اس طرح کی پرورش و حفاظت جس طرح رحمِ مادر میں بچے کی ہوتی ہے) لہٰذا "جعل بینکم مودۃ ورحمۃ" کا مطلب یہ ہوا کہ مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے ایک دوسرے کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور توازن پذیر ہوتی ہیں۔ لہٰذا مرد کا یہ سمجھنا کہ میں عورت سے افضل ہوں ایک خود ساختہ پندار ہے جس کا قانونِ کائنات کی میزان میں کوئی وزن نہیں۔

عورت کی منفرد خصوصیات

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں مرد اور عورت میں بیشتر انسانی خصوصیات مشترک ہیں مثلاً عقل و بصیرت کی خصوصیت۔ زندگی کے ان گوشوں میں جن میں ان کی خصوصیات مشترکہ ہیں یہ دونوں دوش بدوش چلیں گے۔ لیکن اس تقسیمِ عمل کی رو سے (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) عورت کو حیاتیاتی طور پر (Biologically) ایسا بنایا گیا ہے کہ اس میں بچے کی تولید و پرورش کے لئے ایسی خصوصیات ہیں جن سے مرد محروم ہے۔ عورت کی یہ خصوصیات معاشرہ کی ایک بنیادی ضرورت (اور مرد کی ایک بہت بڑی کمی) کو پورا کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے

عورت کا درجہ مرد سے فائق ہے۔ لیکن اس خصوصی گوشہ (بچوں کی پیدائش و پرورش) کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں عورت کی زندگی کا بیشتر حصہ صرف ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں وہ طبعی طور پر (Physically) اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ زندگی کے ان شعبوں میں جن میں سخت محنت و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے، حصہ لے سکے۔ اس سے معاشرہ میں ایک کمی واقعہ ہو جاتی ہے اس کمی کو مرد پورا کرتا ہے۔ وہ اپنا پورا وقت وسائل پرورش کے بڑھانے میں صرف کر سکتا ہے۔ (اسی کو اکتساب رزق کہتے ہیں)۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز مرد کے لئے عورت پر افضلیت کا موجب نہیں بن سکتی۔ عورت اس کی ایک کمی کو پورا کرتی ہے، یہ اس کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ عورت ایک نوعیت سے معاشرہ میں اضافہ کا موجب بنتی ہے، مرد دوسری نوعیت سے۔ ایک کو ایک جہت سے افضلیت حاصل ہوتی ہے، دوسرے کو دوسری جہت سے۔ فضل اللہ بعضھم علی بعض۔ اللہ نے ایک کو دوسرے پر (مختلف خصوصیات کی رو سے) افضلیت دی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہارے خود ساختہ تصورات ہیں جن کی رو سے تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ چونکہ مرد کماتا ہے اور اس کی کمائی عورتوں پر صرف ہوتی ہے اسلئے مرد کو عورت پر افضلیت حاصل ہے[1]۔ اور تم اس خود ساختہ معیارِ فضیلت کو اس حد تک کھینچ کر لے گئے ہو کہ عورت کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھتا ہے کہ میں عورت کیوں بن گئی مرد کیوں نہ بنی۔ وہ کہتا ہے کہ جس معاشرہ کا تصور میں پیش کرتا ہوں اس میں کبھی عورت کے دل میں اس قسم کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علیٰ بعض۔ (۴/۳۲) اللہ نے جو خصوصیات تم میں سے ایک صنف کو دی ہیں وہ ایسی باعثِ امتیاز ہرگز نہیں کہ ان کی بنا پر صنفِ مقابل یہ آرزو کرنے لگ جائے کہ مجھے دوسری صنف کی خصوصیات کیوں نہ مل گئیں۔ مرد اور عورت کے جو میدان الگ الگ ہیں ان کے اعتبار سے ان کی خصوصیات میں اختلاف ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ یہ دونوں اپنے اپنے میدان میں، فرائض مفوضہ کو پوری پوری محنت اور حسن و خوبی سے سرانجام دیتے ہیں یا نہیں۔ اپنے اپنے میدان میں جو جسقدر سعی و عمل کریگا اسی کے مطابق معاشرہ کی خوشگواریوں میں اس کا حصہ ہوگا۔ للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیبٌ مما اکتسبن۔ (۴/۳۲) تم صرف یہ آرزو کیا کرو کہ جو تمہارا میدان ہے اس میں تمہیں سعی و عمل کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت و توفیق نصیب ہو۔ واسئلوا اللہ من فضلہ (۴/۳۲)

مشترکہ صلاحیتیں تقسیمِ عمل کے اس فرق کو چھوڑ کر باقی انسانی صلاحیتیں مرد اور عورت دونوں میں موجود ہیں، سورۂ احزاب میں دیکھئے۔ کس طرح ان صلاحیتوں میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔

ان المسلمین والمسلمات۔ والمؤمنین والمؤمنات۔ والقٰنتین والقٰنتات۔ والصٰدقین والصٰدقٰت والصابرین والصابرات۔ والخاشعین والخاشعات۔ والمتصدقین والمتصدقات۔ والصائمین

---

[1] اگر یہ اصول صحیح مان لیا جائے کہ کمانے والوں کو کھانے والوں پر افضلیت ہوتی ہے تو بڑے بڑے مفکرین، مدبرین، اور ایجادات کرنے والے پر کاشتکاروں کو ہمیشہ افضلیت ہونی چاہئے۔ اور میدانِ جنگ میں لڑنے والے مجاہدین کا درجہ مزدوروں سے بہت نیچا ہونا چاہئے۔

والصائمات۔ والحافظین فروجھم والحٰفظٰت۔ والذاکرین اللہ کثیرًا والذاکرات۔ اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما۔ (۳۳/۳۵)

اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی تکمیلِ ذات کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (المسلمین والمسلمات)۔ اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو، تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں (المومنین والمؤمنات)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے۔ (والقانتین والقٰنتٰت)۔ اگر مرد اپنے دعوٰے ایمان کو اعمال سے سچ کر دکھانے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (والصٰدقین والصٰدقٰت)۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں۔ (والصابرین والصابرات) اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں اور جھکتے چلے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں میں بھی ہے (والخاشعین والخاشعات)۔ اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہو تو عورتوں میں بھی ہے۔ (والمتصدقین والمتصدقات) اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انھیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں، تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ (والصائمین والصائمات)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (والحافظین فروجھم والحافظات)۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (والذاکرین اللہ کثیرًا والذاکرات)۔ جب یہ صلاحیتیں دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کیلئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے۔ (واعد لھم مغفرۃ واجرا عظیما)۔

قرآن کی ان تفاصیل پر غور کرو طاہرہ! اور پھر سوچو کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے اور عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کر سکتا ہے اور عورت نہیں کر سکتی۔ مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔ گھر کی جنت میں، معاشرے کی جنت میں اور پھر اس زندگی سے متصل، اگلی زندگی کی جنت میں (ومن یعمل من الصٰلحٰت من ذکر او انثٰی وھو مؤمن فاولٰئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرا۔ ۴/۱۲۴) ان میں سے کسی کے کام کا نتیجہ ضائع نہیں ہوگا۔ (لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثٰی ۳/۱۹۴)

تم نے دیکھ لیا ہوگا طاہرہ! کہ قرآن کی رُو سے

(۱) انسانیت کی تمام صلاحیتیں مردوں اور عورتوں میں موجود ہیں۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کا صحیح صحیح مصرف،

مقصودِ حیات ہے۔ لہذا اس باب میں مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ دونوں "جنت میں داخل ہونے" کے اہل ہیں۔ اسلئے ان میں سے کسی صنف کو دوسری صنف پر کوئی وجہِ امتیاز نہیں۔

(۲) البتہ تقسیمِ کار کے کائناتی اصول کی بناء پر، بعض فرائض ایسے ہیں جنھیں صرف عورت ہی سرانجام دے سکتی ہے۔ اس اعتبار سے عورت معاشرہ میں ملک کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرتی ہے لیکن عورت کی زندگی کا ایک حصہ انہی فرائض کی سرانجام دہی میں صرف ہو جاتا ہے اور وہ طبعی طور پر اکتسابِ رزق کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتی۔ معاشرہ کی اس کمی کو مرد پورا کرتا ہے۔ لیکن جس طرح عورت، مرد پر یہ احسان نہیں رکھ سکتی کہ وہ ان فرائض کو سرانجام دیتی ہے جن کی سرانجام دہی مرد کے لئے ممکن نہیں اسی طرح مرد بھی عورت پر یہ کہہ کر تحکم نہیں جما سکتا کہ وہ کماتا ہے، اور عورت اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کمانے سے معذور رہتی ہے۔

(۳) معاشرہ کا توازن اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ قانونِ کائنات کی رُو سے جو فریضہ جس کے سپرد کیا گیا ہے وہ اسے نہایت حسن وخوبی سے سرانجام دے۔

(۴) اس اعتبار سے کاروبارِ زندگی کے دو دائرے بن گئے۔ ایک دائرہ وہ جس کے فرائض صرف عورت سرانجام دے سکتی ہے اور دوسرا دائرہ وہ جس میں مرد اور عورت دونوں مشترکہ طور پر شریک ہو سکتے ہیں۔

(۵) جس طرح یہ غلط ہوگا کہ عورت ان فرائض کو سرانجام نہ دے جن کی خصوصیت (EXCLUSIVELY) اسی کے حصے میں آئی ہے۔

اسی طرح یہ بھی غلط ہوگا کہ اسے اسی دائرے کے اندر محبوس کر دیا جائے اور مشترکہ دائرے میں آنے کی اجازت ہی نہ دی جائے۔ ان دونوں صورتوں میں معاشرہ کا نظام بگڑ جائے گا۔

مرد عورتوں پر حاکم ہیں؟

قرآن کی ان تصریحات کے بعد اب اس آیت کو دیکھو جو تمہارے لئے اس درجہ وجہِ پریشانی بن رہی ہے۔ آیت یہ ہے:-

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض فالصلحت قنتت حفظت للغیب بما حفظ اللہ۔ والتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبتغوا علیھن سبیلا ان اللہ کان علیا کبیرا۔ (۴/۳۴)

تم اپنی پریشانی میں بھی سچی ہو۔ اسلئے کہ تم قرآن کو انہی ترجموں سے سمجھ سکتی ہو جو ہمارے ہاں مروج ہیں۔ اور ان ترجموں سے انسان بیشک اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جس تک تم پہنچی ہو۔ یہی ترجمے تو ہیں جن کی بناء پر مرد اپنے "ڈنڈے" کے لئے اس آیت کو "خدائی سند" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے:

مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو اوپر بعض کے۔ اور بہ سبب اس کے کہ خرچ

کرتے ہیں مالوں اپنے سے۔ پس نیک بخت عورتیں فرمانبردار ہیں۔ نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔
اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو، اور چھوڑ دو ان کو بیچ خوابگاہ کے۔ اور مارو ان کو پس
اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈھو اوپر ان کے راہ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین رح)

یعنی چونکہ مرد کماتے ہیں اور عورتوں پر اپنا روپیہ صرف کرتے ہیں اس لئے وہ عورتوں پر حاکم ہیں۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ مرد کی فرمانبردار رہے اور اگر اس کی فرمانبرداری میں کوئی فرق آجائے تو مرد کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ اسے مارے۔

یہ ہے عورت کی پوزیشن اس قرآن کی رُو سے جو ہمارے مروجہ ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچوں، تمہیں لگے ہاتھوں ایک اہم نکتہ سمجھائے دیتا ہوں۔ جب میں کہتا ہوں کہ ہمارے مروجہ ترجمے قرآن کا صحیح مفہوم پیش نہیں کرتے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بزرگ جنھوں نے یہ ترجمے کئے تھے، عربی کے بڑے بڑے عالم تھے۔ پھر کیا ہوا کہ یہ صحیح ترجمہ نہ کر سکے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جاتا ہے کہ اسوقت مسلمانوں کے وہ ممالک بھی موجود ہیں جن کے باشندوں کی مادری زبان عربی ہے۔ اگر وہ بھی قرآن کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے تو پھر اور کون صحیح مفہوم سمجھ سکے گا؟

ترجمے صحیح کیوں نہیں ہوئے یہ اعتراضات بڑے وزنی ہیں اس لئے ان کے جواب کے لئے اصل حقیقت کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ جن بزرگوں نے یہ ترجمے کئے ہیں ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ یہ کیسے متعین کیا جائے کہ قرآن کے فلاں لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ انھیں لامحالہ اہل زبان ہی کی طرف رجوع کرنا تھا۔ ہمارے ہاں تیسری صدی ہجری سے لیکر ان بزرگوں تک سینکڑوں تفاسیر عربی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض مفسرین، تفسیر کے علاوہ، عربی ادب کے بھی امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً تفسیر کشاف کے مصنف، علامہ زمخشری۔ یا مثلاً تفسیر جلالین، جس میں التزام یہ کیا گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے مرادف عربی الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں۔ ہمارے مترجمین کے لئے عربی کی ان تفسیروں میں بیان کردہ مفہوم سند کا درجہ رکھتا تھا۔ اسی طرح عربی ممالک کے باشندوں کے لئے بھی ان عربی تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم، سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہمارے ترجموں میں قرآن کا جو مفہوم دیا گیا ہے (یا جو مفہوم خود عربی بولنے والے سمجھتے ہیں) وہ دراصل قرآن کا وہ مفہوم ہے جو ہمارے اسلاف کی عربی تفاسیر میں درج ہو چکا تھا۔ مثال کے لئے یہی (زیر نظر) آیت دیکھو۔ اس میں الرجال قوامون علی النساء میں قوامون کا ترجمہ کیا گیا ہے حاکم۔ ہمارے بزرگوں نے قوامون کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان عربی تفاسیر کو دیکھا تو کشاف میں اس کا مفہوم لکھا تھا مسیطرین یعنی داروغے۔ اور جلالین میں لکھا تھا متسلطین۔ یعنی عورتوں پر مسلط۔ اب ظاہر ہے کہ جب ہمارے مترجمین نے دیکھا کہ بیائہ تفسیر وادب، قوامون کا مفہوم مسیطرین اور متسلطین بتاتے ہیں تو انھوں نے اس کا ترجمہ حاکم کر دیا۔ یہ ان الفاظ کا صحیح ترجمہ ہے۔ لیکن یہ ترجمہ قرآن کے لفظ قوامون کا نہیں بلکہ قوامون کے اس مفہوم کا ترجمہ ہے جو کشاف اور جلالین میں دیا گیا ہے۔ لہٰذا ہمیں (ان ترجموں کی بجائے) اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ان تفاسیر میں یہ مفہوم کس طرح آگیا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، یہ تفاسیر اس دور میں لکھی گئی تھیں جب ہمارے معاشرے پر ملوکیت کا استبداد غالب آچکا تھا اور

ہماری "شریعت" اور "طریقت" مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے تصورات سے متاثر ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں عورت کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر قرار پا چکی تھی۔ ان تفاسیر میں سب سے پہلے طبری کی تفسیر لکھی گئی۔ (باقی تفسیریں درحقیقت اسی تفسیر پر لکھی ہوئی "طرحی غزلیں" ہیں)۔ طبری کا انداز یہ ہے کہ اس میں قرآن کا مفہوم روایات کی رو سے متعین کیا گیا ہے۔ یہ چیز میرے متعدد مضامین میں بیان کی جا چکی ہے کہ روایات کس طرح وضع ہوئیں اور انھیں کیسے مرتب اور جمع کیا گیا۔ روایات کی تاریخ سے اس حقیقت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا کہ روایات کے وضع کرنے میں کوئی دشواری ہی نہ تھی۔ یہ روایات عکس ہیں اس معاشرے کا جس میں یہ وضع کی گئی تھیں (نہ کہ رسول اللہؐ کے عہد مبارک کا)۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کا جو مفہوم ان روایات کی رو سے متعین کیا گیا تھا وہ کس قسم کا ہوگا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پھر اسی آیت کی مثال سامنے لاؤ جو اس وقت زیر نظر ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کشاف وغیرہ نے قوامون کا مفہوم متسلطین اور مسیطرین بیان کیا ہے اور اسی آیت سے عورتوں کو مارنے پیٹنے کا جواز نکالا ہے۔ اس آیت کی "شانِ نزول" میں جو روایات ہماری کتابوں میں لکھی ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبی اکرمؐ سے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ آپ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت نازل ہوگئی اور حضورؐ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ عورتوں کو مارا نہ کرو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ عورتیں آپ کے حکم کو سن کر اپنے خاوندوں پر دلیر ہوگئی ہیں۔ اس پر آپ نے انھیں مارنے کی اجازت دیدی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوگئی اور بہت سی عورتیں شکایت لیکر آپ کے پاس آئیں۔ اس پر آپ نے مردوں سے کہا کہ جو لوگ عورتوں کو مارتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے۔ لیکن جب آپ نے عورتوں کو اس کا بدلہ دلوانا چاہا تو یہ آیت نازل ہوگئی۔ لہٰذا حکم یہی رہا کہ چونکہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے انھیں مار پیٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمرؓ کا مہمان ہوا تو اتفاقاً میاں بیوی میں ناچاقی ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اشعث تین باتیں یاد رکھو جو میں نے رسول اللہؐ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی بیوی کو کس بنا پر مارا۔ دوسرے یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سونا۔ اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔

یہی نہیں کہ مردوں کو عورتوں پر حاکم مقرر کیا گیا ہے بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ وہ ماسوائے اللہ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ (اس حدیث کی تشریح میں اور احادیث بھی ہیں لیکن وہ ایسی نہیں جنھیں ایک باپ اپنی بیٹی کو لکھ سکے)۔

یہ ہیں وہ روایات جو زیر نظر آیت کی تفسیر میں ہماری سب سے قدیم کتب تفاسیر میں مذکور ہیں۔ انہی روایات کی بنا پر قوامون کا مفہوم متسلطین (غلبہ و تسلط کے مالک) اور مسیطرین (داروغہ) لیا گیا۔ اور اسی مفہوم کا ترجمہ ہمارے ہاں حاکم کیا گیا۔ پھر انہی کے مطابق ہماری فقہ کے احکام مدون ہوئے۔ چنانچہ جصاص نے احکام القرآن میں انہی روایات و تفاسیر کی بنا پر عورتوں کو مارنے پیٹنے اور بند رکھنے کے تمام فقہی قوانین بیان کر دیئے ہیں۔

ان روایات کی وجہ سے ایک بڑی مشکل اور بھی واقع ہوگئی۔ اگر ہمارے یہ مفسرین حضرات، قرآنی آیات کا مفہوم اپنی طرف سے متعین کرتے تو بعد میں آنے والوں کے لئے اتنی گنجائش رہ سکتی تھی کہ ان کے بیان کردہ مفہوم سے اختلاف کر سکتے۔ لیکن جب انھوں نے اپنے بیان کردہ مفہوم کی تائید میں رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کردہ احادیث درج کر دیں تو ان کا متعین کردہ مفہوم رسول اللہ کا بیان فرمودہ مفہوم قرار پا گیا۔ اس کے بعد کس کی مجال تھی کہ وہ اس مفہوم سے اختلاف کا خیال تک بھی ذہن میں لا سکتا۔ چنانچہ جس کسی نے اس مفہوم سے اختلاف کا خیال ظاہر کیا اسے فوراً کہدیا گیا کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسولؐ اللہ زیادہ بہتر سمجھتے تھے؟ اب کونسا ایسا سوختہ بخت مسلمان ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں رسول اللہ سے بھی بہتر قرآن سمجھتا ہوں۔ اس طرح ان تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم ابدی طور پر مستند قرار پا گئے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم رسولؐ اللہ کے متعین فرمودہ نہیں تھے بلکہ یہ ان روایات کی رو سے متعین کئے گئے تھے جو رسول اللہؐ کی وفات کے سینکڑوں سال بعد وضع کی گئیں۔ رسولؐ اللہ کا متعین فرمودہ مفہوم وہ ہو سکتا تھا جسے رسول اللہؐ قرآن کے ساتھ خود ایک کتاب میں لکھکر یا لکھوا کر مستند طور پر امت کو دیکر جاتے۔ رسولؐ اللہ نے کوئی ایسی تفسیر امت کو نہیں دی۔ اسلئے ان کتب تفاسیر میں بیان کردہ مفہوم رسولؐ اللہ کا نہیں، خود ہمارے مفسرین کا مفہوم ہے جو اس دور میں متعین کیا گیا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن جس کی تائید میں وہ روایات درج کر دی گئیں جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔

اب تم نے سمجھ لیا ہوگا طاہرہ! کہ "الرجال قوامون علی النساء" میں قوامون کا ترجمہ، حاکم، مسلط اور داروغہ کس طرح کیا گیا۔ اس مقام پر ایک لطیف بات کا ذکر بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو اس کا احساس ہوا کہ ان روایات کی رو سے ممکن ہے کوئی غیر مسلم یہ اعتراض کر دے کہ رسولؐ اللہ نے عورتوں کے ساتھ اس قسم کے سخت سلوک کی اجازت دیدی؟ اب دیکھو کہ اس اعتراض سے بچنے کی صورت کیا پیدا کی گئی! ایک روایت میں ہے کہ جب آپ نے اس عورت کو جس نے اپنے خاوند کی شکایت کی تھی) بدلہ لینے کی اجازت دی تو خدا کی طرف سے یہ آیت نازل ہوگئی۔ اس پر رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اردنا امرا واراد اللہ غیرہ یعنی ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور اللہ نے اس کے خلاف حکم دیدیا۔ تم سمجھیں طاہرہ! کہ یہ بات کیا ہوئی! اس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ رسولؐ اللہ تو چاہتے تھے کہ عورتوں سے عدل و انصاف کیا جائے لیکن جب خدا نے اس کے خلاف حکم دیدیا تو رسولؐ اللہ مجبور ہو گئے۔ لہذا آپ کو بھی اسی کے مطابق تعلیم دینی پڑی۔

اس روایت کے وضع کرنے والے نے بزعم خویش، رسولؐ اللہ کو تو اس اعتراض سے بچا لیا لیکن اتنا نہ سوچا کہ وہی اعتراض اب خود خدا پر بھی عائد ہو گیا۔ بلکہ اعتراض کی شدت اس اعتبار سے اور بھی بڑھ گئی کہ خود رسولؐ اللہ نے خدا کے حکم کی سختی کو محسوس کیا جبھی تو کہا کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور ہی حکم دیدیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔ اسلئے کہ رسولؐ اللہ جو اپنی مرضی کو پورے پورے طور پر خدا کی مرضی (یعنی قانونِ خداوندی) سے ہم آہنگ رکھتے (اور ہم آہنگ رکھنے کی تمنا کرتے) تھے، کبھی یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم کچھ اور چاہتے تھے اور خدا نے کچھ اور حکم دیدیا؟[1]

---

[1] جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ رسولؐ اللہ نے تمام عمر جو کچھ فرمایا وہ خدا کی طرف سے وحی (غیر متلو) کی رو سے ہوتا تھا وہ غور کریں کہ رسول اللہؐ نے یہ کیوں فرمایا کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے کچھ اور حکم دیدیا۔

آیت کا صحیح مفہوم

مجھے اس کا احساس ہے طاہرہ! کہ تم بجد مضطرب ہو کہ "الرجال قوامون علی النساء" والی آیت کا قرآنی مفہوم جلدی سے سامنے آجائے۔ لیکن جب تک تمہارے سامنے وہ پس منظر نہ آتا جس میں مروجہ مفہوم متعین ہوا تھا صحیح مفہوم واضح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ وجہ ہے کہ میں نے صحیح مفہوم تک آنے سے پہلے ان تفاصیل کا بیان کر دینا ضروری سمجھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ اس آیت میں میاں اور بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔ الرجال (عام مردوں) اور النساء (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں۔

یہ تم دیکھ چکی ہو کہ عورتیں اپنے خصوصی فرائض کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکتساب رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔ ان کے برعکس مردوں کا سارا وقت اس کے لئے فارغ ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے تقسیم کار کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ بنایا کہ وہ قوامون علی النساء ہیں۔ لغت میں قام الرجل علی المرأۃ کے معنی دیئے ہیں مانھا یعنی اس نے روزی مہیا کی۔ قوام علیھا کے معنی ہیں مائن لھا۔ یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اس سے آیت کا مفہوم واضح ہو گیا۔ الرجال قوامون علی النساء۔ معاشرہ میں مردوں کے ذمے یہ فریضہ ہے کہ وہ اکتساب رزق کریں۔ اس لئے کہ (بما فضل اللہ بعضھم علیٰ بعض) تقسیم کار کے اصول کی بنا پر ایک قسم کی استعداد مردوں کو زیادہ دی گئی ہے اور دوسری قسم کی استعداد عورتوں کو۔ اور چونکہ مردوں کا سارا وقت اکتساب رزق کے لئے فارغ ہوتا ہے اور عورتیں اس سے معذور ہو جاتی ہیں اسلئے مردوں کا کمایا ہوا رزق، عورتوں کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے (بما انفقوا من اموالھم)۔ اس سے عورتوں کی ضروریات زندگی پوری ہوتی جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پائیں گی۔ (فالصّٰلحٰت)۔ اور انہیں فراغت نصیب ہو جائے گی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسی مصرف میں لائیں جس کے لئے وہ خاص صلاحیتیں پیدا کی گئی ہیں۔ یہ معنی ہیں قٰنتٰت کے۔ سقاء قنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرنے کے بعد اسے اس طرح اچھی طرح سی کر بند کر دیا جائے کہ وہ اپنا پانی محفوظ رکھے۔ راستے میں کہیں نہ گرائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس کا منہ کھل سکے۔ اگر عورتوں کو اکتساب رزق کرنا پڑے تو جس مقصد کے لئے انہیں خاص صلاحیتیں دی گئی تھیں وہ مقصد پورا نہیں ہوگا کیونکہ وہ صلاحیتیں غیر محل میں صرف ہو جائیں گی۔ اس کے بعد دو لفظوں میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا جب فرمایا کہ حٰفِظٰت للغیب بما حفظ اللہ۔ یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح ان کی حفاظت (پرورش) کا سامان بہم پہنچا دیا تو انہیں اطمینان اور فرصت مل گئی کہ وہ اس چیز کی حفاظت کر سکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے (یعنی جنین کی حفاظت)۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں، طاہرہ! ایک تو یہ کہ قرآن، عورتوں کے خصوصی فرائض اور ان سے متعلقات امور کا تذکرہ ایسے سنجیدہ استعاروں میں کرتا ہے کہ انہیں ایک باپ اپنی بیٹی سے بھی بلا تامل بیان کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مروجہ تراجم اور تفاسیر کی رو سے بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں کیونکہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ (ان کے برعکس) نیک بیویاں (فالصّٰلحٰت) کا شیوہ یہ ہے کہ وہ فرمانبردار (قٰنتٰت) ہوتی ہیں۔ اور مرد کی غیر حاضری میں اپنی عصمت کی حفاظت

کرتی ہیں۔ یعنی مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں پر حکومت کریں۔ اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ مردوں کی فرمانبرداری کریں اور عصمت کی حفاظت۔ گویا صٰلحٰت اور قٰنتٰت اور حٰفظٰت ہونا صرف عورتوں کے لئے ہے۔ حالانکہ قرآن نے (سورۂ احزاب کی ان آیات میں جنھیں پہلے درج کیا جا چکا ہے) یہ سب خصوصیات مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترکہ طور پر بیان کی ہیں۔ اس لئے اگر فرمانبردار ہونا عورت کے لئے ضروری ہے تو قرآن کی رو سے مرد کے لئے بھی ضروری ہے۔ لہٰذا یہ مفہوم کہ مرد کمانے اور حکومت کرنے کے لئے ہیں اور عورتیں، مردوں کی فرمانبرداری کرنے کے لئے، اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے اور رفاقت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق (زوج) ہوتے ہیں اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنے والے۔

عورتوں کو مارنا

اب اس سے آگے بڑھو۔ آیت کا باقیماندہ حصہ یہ ہے (واللتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن)۔ چونکہ ہماری تفسیروں میں یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مرد کا کام عورت پر حکومت کرنا اور عورت کا کام مرد کی فرمانبرداری کرنا ہے اسلئے باقیماندہ آیت کا مفہوم، اسی کی تائید میں، یہ لیا گیا کہ اگر بیوی، مرد کی فرمانبرداری نہ کرے تو وہ پہلے اسے سمجھائے بجھائے، پھر اس سے باہمی تعلقات منقطع کر لے اور اس پر بھی کام نہ چلے تو اسے مارے۔

لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہو رہی۔ عام مردوں اور عورتوں کے فرائض کے متعلق ہو رہی ہے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ تقسیم عمل کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں اور عورتیں، رزق کی طرف سے دل مطمئن ہو جانے کے بعد اپنے خصوصی فرائض کو بطریقِ احسن سرانجام دیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اگر عورتیں ان انتظامات کے باوجود (جن کی رو سے وہ اکتساب رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہیں) معاشرہ کے اس نظم اور تقسیم کار کے اصول سے سرکشی اختیار کریں (جیسا کہ آجکل یورپ کے بعض ممالک میں ہو رہا ہے) تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی فوضویت (ANARCHY) کو روکے۔ اس لئے کہ اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسل انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی عورتوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ان کی روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کا موجب ہے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر انھیں ان کی خوابگاہوں میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک قسم کی نظر بندی (INTERNMENT) کی سزا ہوگی۔ اور اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکیں تو پھر انھیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا (CORPORAL PUNISHMENT) بھی دی جا سکتی ہے۔

یہ ہے عزیزہ! صحیح مفہوم اس آیت کا جس کی رو سے ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ خاوند عورتوں پر حاکم اور داروغے ہیں اور انھیں حق حاصل ہے کہ وہ بیویوں کو اپنا محکوم رکھیں کیونکہ بیوی، مرد کی کمائی کھاتی ہے۔ بیوی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خاوند کی تابعدار رہے اور اگر وہ اس کی فرمانبرداری نہ کرے تو میاں کو حق حاصل ہے کہ وہ ڈنڈے کے زور سے اپنا حکم منوائے۔

ایک اور مفہوم اس آیت کا ایک مفہوم اور بھی ہو سکتا ہے (جس کی طرف میں نے ضمناً پہلے اشارہ کیا ہے)۔ یا یوں سمجھو کہ وہ مفہوم مذکورہ بالا مفہوم کا دوسرا گوشہ ہے۔ الرجال قوامون علی النساء میں لفظ قوامون (واحد قوام) کا مادہ قام ہے۔ عربی زبان میں قیام، اعتدال اور توازن کو کہتے ہیں۔ قوام کے معنی ہیں اعتدال کو لئے ہوئے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (ہم نے انسان کو بہترین توازن و اعتدال کے ساتھ پیدا کیا)۔ میں لفظ تقویم کے معنی بھی اعتدال و توازن کے ہیں۔ یہی معنی صراط مستقیم میں لفظ مستقیم کے ہیں۔ یعنی زندگی کی توازن بردوش راہ۔ قوام مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں مکمل طور پر اعتدال و توازن کو لئے ہوئے۔

علیٰ کے معنی عام طور پر اوپر کے جاتے ہیں (مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں) لیکن عربی زبان میں اس کا استعمال بڑے وسیع معانی میں ہوتا ہے۔ مثلاً "ذریعے" یا "کی وجہ سے"۔ (خود قرآن میں بھی اس کا استعمال ان معانی میں ہوا ہے) لہٰذا الرجال قوامون علی النساء کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر مرد چاہتے ہیں کہ وہ اپنی ذات (یا معاشرہ) میں مکمل اعتدال و توازن پیدا کریں تو وہ "عورتوں کے ذریعے" ہی ایسا کر سکتے ہیں۔ عورتوں کو نظر انداز (NEGLECT) کر کے تنہا مرد کبھی قوام نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ اللہ نے بعض خصوصیات مردوں کو دی ہیں اور بعض خصوصیات عورتوں کو۔ مرد اکتساب رزق کے لئے محنت اور مشقت کرتے ہیں اور عورتیں ان کیلئے سکون کے سامان فراہم کرتی ہیں۔ (لتسکنوا الیہا ۳۰/۲۱) وہ سامان جو اُن کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنتا ہے (ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ اعین۔ ۲۵/۷۴) یہ ظاہر ہے کہ کوئی فرد ایک قسم کے جذبات و عواطف سے کبھی متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کیلئے مختلف جذبات کی باہمی آمیزش کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر مرد چاہتے ہیں کہ وہ بہترین متوازن شخصیت کے حامل ہوں (اور اس طرح خود معاشرہ بھی بہترین توازن کا آئینہ دار بن جائے) تو یہ مقصد عورتوں کے ذریعے (یا انہیں ساتھ رکھ کر) ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ عورت کو نظر انداز کر کے نہیں ہو سکتا۔ الرجال قوامون علی النساء۔ یہ مفہوم اس لئے بھی زیادہ قرین صواب ہے کہ یہ اس کائناتی قانون کے مطابق ہے جس کی رو سے اشیائے کائنات میں ہر شے کی تکمیل اس کی زوج سے ہوتی ہے۔ اور اس سے کائنات میں اعتدال و توازن قائم ہے۔

ممکن ہے تمہارے دل میں یہ خیال آئے (تمہارے دل میں آئے یا نہ آئے لیکن سلیم تو جھٹ سے کہہ دیگا) کہ اس کی تاکید مردوں ہی کو کیوں کی گئی کہ تمہاری ذات کا توازن عورتوں کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ عورتوں کو بھی اس کی تاکید کیوں نہ کی گئی کہ تمہارا توازن مردوں کے ذریعے ہو سکتا ہے اسلئے تم مردوں کو نظر انداز نہ کر دینا۔ سو اس کا جواب تو ظاہر ہے۔ انسان کی ساری تاریخ میں (بجز چند مستثنیات کے) یہ خیال ہمیشہ مرد ہی کے دل پر مسلط رہا ہے کہ عورت کی حیثیت کچھ نہیں۔ میں اپنی ذات میں خود مکتفی ہوں۔ مجھے عورت کی کیا احتیاج ہے۔ اس سے اس تاکید کی ضرورت مردوں ہی کے لئے تھی۔ عورت بیچاری نے تو (مستثنیات کو چھوڑ کر) کبھی یہ خیال اپنے دل میں آنے ہی نہیں دیا کہ اسے مرد کی کیا پرواہ ہے۔ اسلئے قرآن نے اس کی تاکید مردوں کے لئے ضروری سمجھی۔ یہ قرآن کا اسلوب ہے۔ وہ اپنی عمومی تعلیم میں بھی تاکید انہی کو کرتا ہے جنہیں اس تاکید کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً انسانی

معاشرہ میں ضروری ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش کریں، اور جب وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کے بچے ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔ قرآن نے اولاد کو تو اس کی تاکید کی ہے کہ وہ ماں باپ سے نیک سلوک کیا کریں۔ ماں باپ سے کہیں نہیں کہا کہ وہ اپنی اولاد سے اچھا سلوک کیا کریں۔ اسلئے کہ ماں باپ تو بہرحال اپنی اولاد کی نگہداشت رکھتے ہیں اور ان کی پرورش کا انتظام کرتے ہیں انھیں اس کی تاکید کی ضرورت نہیں۔ لیکن اولاد چونکہ ماں باپ کی طرف سے (بالعموم) لاپرواہ ہو جاتی ہے اسلئے انھیں تاکید کی گئی کہ وہ بوڑھے ماں باپ سے حسنِ سلوک سے پیش آیا کریں۔ بہرحال اس آیت کا مفہوم یہ لیا جائے یا وہ۔ اتنی بات تو واضح ہے کہ قرآن کا قطعاً یہ مقصود نہیں کہ خاوند عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں اور انھیں حق حاصل ہے کہ جب بیوی ان کی فرمانبرداری نہ کرے تو اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیں۔

خط بہت لمبا ہو گیا طاہرہ! اور تمہاری کئی باتوں کا جواب باقی رہ گیا۔ بہرحال، اب میں تمہیں التزاماً خط لکھا کروں گا۔ ان خطوط میں رفتہ رفتہ تمہاری تمام باتوں کا جواب آتا جائے گا۔ لیکن دیکھنا۔ خطوط کے جواب میں جلدی نہ مچانا۔ مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔

کراچی۔ ۱۲ مئی ۱۹۵۳ء

پرویز

سیرتِ صاحبِ قرآن خود قرآن کے آئینہ میں

معراجِ انسانیت

معارف القرآن۔ جلد چہارم

ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کے قلم سے جو فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صحیح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔ قیمت بتیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔ لیکن ۳۱ جولائی ۵۳ء تک کتاب کی رعایتی قیمت صرف پندرہ روپے لی جائیگی۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

مسلمانوں میں ملوکیت کی ابتداء

تاریخ کی روشنی میں

[اس مضمون کی پچھلی قسط میں جو اپریل ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں شامل ہے بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کب اور کیسے شروع ہوئی۔ زیر نظر قسط میں یہ حقیقت پیش کی گئی ہے کہ مسلمانوں میں ملوکیت نے کب اور کیسے جنم لیا اور وہ کیا واقعات تھے جو خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دینے کی بنیاد بنے۔ اس ضمن میں ایک اہم حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو وہ لامحالہ ہمارے اسلاف سے بحث کریگی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان اسلاف کے متعلق بعض باتوں کو ایک طرح سمجھتے چلے آرہے ہوں اور تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس نتیجہ تک پہنچائے کہ نہیں! بات یوں نہیں بلکہ یوں تھی۔ اس سے بعض اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسلاف میں سے کسی ایک کے متعلق جو رائے ہم پہلے رکھتے تھے اسے بدلنا پڑے۔ تاریخ کے صحیح مطالعہ کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اگر واقعات اس کے متقاضی ہوں تو ہم اپنی رائے میں تبدیلی کر لیں۔ اگر ہم اس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر تاریخی تحقیق و تدقیق سے کچھ حاصل نہیں۔

لیکن رائے (یا عقیدہ) کی تبدیلی بعض اوقات ہمت طلب مرحلہ ہو جاتی ہے۔ بالخصوص جب اس سے ہماری کسی عقیدت کو ٹھیس لگتی ہو۔ اگر تاریخی مطالعہ میں کوئی مقام ایسا آجائے تو اس وقت یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس سے ہمارے اسلاف کی (معاذ اللہ) توہین ہوتی ہے۔ حضرات سلف ہم سب کے بزرگ تھے۔ انھوں نے اسلام کی خاطر جو احسن خدمات سرانجام دی ہیں ان کا کسے اعتراف نہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بالآخر انسان ہی تھے اس لئے ان سے فیصلوں میں غلطیاں بھی ہو سکتی تھیں۔ وہ بشریت کے دوسرے تقاضوں سے بھی (شعوری یا غیر شعوری طور پر) متاثر ہو سکتے تھے۔ ان باتوں سے ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آجاتا بلکہ جب ہم انھیں انسان تسلیم کر کے دیکھیں کہ انھوں نے کتنے کتنے بڑے کام سرانجام دیئے تو ان کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسلئے اگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچائے کہ فلاں معاملہ میں فلاں صاحب سے فیصلہ میں غلطی ہو گئی تو اس سے ہمیں بجبیں ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہئے۔ اسلاف کے متعلق قرآن ہم سے صرف اتنا ماننے کا تقاضا کرتا ہے کہ تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔ ولا تسئلون عما کانوا یعملون۔ (۲:۱۳۴) "یہ لوگ اپنے اپنے کام کر کے دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انھوں نے کیا اس کا بدلہ ان کے لئے ہے جو کچھ تم کرو گے اس کا بدلہ تمہارے لئے ہوں گے۔ ان کے اعمال کے متعلق تم سے باز پرس نہیں کی جائے گی۔"

سو جب حقیقت یہ ہے کہ ان کے اعمال کے متعلق ہم سے باز پرس نہیں کی جائیگی تو ان کی غلطیوں پر ہمارے لئے ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیئے۔ تاریخ کے مطالعہ میں ہمیں اس بنیادی اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ طلوع اسلام کسی فرقہ کا ترجمان نہیں۔ اس کے نزدیک (قرآن کی رو سے) فرقہ بندی شرک ہے۔ اسلئے اس کا کسی فرقہ سے تعلق نہیں اور کسی دوسرے کے خلاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر تاریخ کے مطالعہ میں ہم یہ دیکھیں کہ فلاں معاملہ میں کسی ایسے بزرگ سے غلطی سرزد ہوئی تھی جو کسی ایک فرقہ کے نزدیک زیادہ واجب الاحترام ہیں تو اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ طلوع اسلام اس فرقہ کی تنقیص کرتا ہے اور اس کے فریق مخالف کی تائید۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے طلوع اسلام کے نزدیک تمام فرقے یکساں ہیں اس لئے کسی ایک فرقہ کی تنقیص یا ان کے کسی بزرگ کی (معاذ اللہ) تنکیر اس کا مقصود ہو نہیں سکتی۔ ہمارے دل میں تمام بزرگانِ سلف کا وہ احترام موجود ہے جس کے وہ از روئے قرآن مستحق ہیں۔ اس لئے کسی کی تنقیص یا بے جا تعظیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ ہماری (یا کسی اور محقق) کی تحقیق کا مدار لامحالہ اسی مواد پر مبنی ہو سکتا ہے جو تاریخ کی رو سے ہم تک پہنچا ہے۔ یہ تاریخیں ہماری مرتب کردہ نہیں ہیں۔ نہ ہی قرآن کی طرح یقینی۔ اسلئے اگر تاریخ نے کوئی واقعہ صحیح طریق سے ہم تک نہیں پہنچایا تو اس میں ہم معذور ہیں۔ تاریخ بہرحال تاریخ ہی ہے، وحی آسمانی نہیں ہے جس کا ایک ایک حرف خدا کی حفاظت میں ہم تک پہنچا ہے۔ (طلوع اسلام)

• خلافت علی منہاج النبوۃ خلفائے راشدین تک قائم رہی اور حضرت امیر معاویہ کے زمانے سے وہ ملوکیت میں تبدیل ہو گئی"۔ یہ ہے وہ رائے جو آج تک بڑی شدت و تکرار کے ساتھ ہم پڑھتے اور سنتے چلے آ رہے ہیں۔ آیئے ہم دیکھیں کہ تاریخ کے واقعات ہمیں کس نتیجہ تک پہنچاتے ہیں۔

ہمارا تاریخی ذخیرہ

تاریخ کے مطالعہ میں سب سے زیادہ پریشان کن چیز یہ ہے کہ ہماری تاریخ مخصوص رجحانات سے پاک نہیں ہے جس میں آزادی رائے اور غیر جانب داری کے ساتھ واقعات بیان کئے گئے ہوں۔ ہمارے ہاں سب سے قدیم اور مفصل تاریخ ابن جریر طبری کی ہے اور وہ سنیوں کے امام ہونے کے باوجود شیعہ تھے۔ باقی تمام مورخین دراصل انہی کے خوشہ چین ہیں۔ لہٰذا تاریخ کے اوراق سے غیر جانبدارانہ بیان کی توقع رکھنا ناممکن سا ہے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں تصنیف و تالیف کا دور دوسری صدی ہجری کے آواخر بلکہ تیسری صدی سے شروع ہوتا ہے جو خلافت عباسیہ کا دور حکومت ہے۔ عباسیین کو بنی امیہ سے جو عداوت تھی وہ ظاہر ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے دور میں (جو دراصل عجمی ملوکیت کا دور اور انتقام لئے ہوئے تھی) کسی مورخ سے یہ امید کم ہی کی جا سکتی ہے کہ وہ بنو امیہ اور امیر معاویہؓ کے ساتھ انصاف سے کام لے سکے۔

عباسی دور حکومت میں تصنیف و تالیف کے میدان میں جن حضرات نے قدم رکھا وہ عموماً عراق اور ایران سے تعلق رکھتے تھے

اور یہی وہ علاقے ہیں جو شیعیت کی جولانگاہ بلکہ تشیع کا گڑھ تھے۔ تشیع کا پودا یہیں بویا گیا اور اسی علاقہ میں وہ پروان چڑھا حتیٰ کہ آجتک بھی یہی علاقہ اس کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جو مصنفین عقیدۃً شیعہ نہیں تھے وہ بھی ماحول کے اثرات سے قدرۃً اتنے مغلوب ضرور تھے کہ بالکلیہ آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں تاریخ سے ہم صحیح رہنمائی کی مکمل توقع نہیں رکھ سکتے۔

مگر حقیقت اور تصنع میں ایک فرق ضرور ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت کے بیان میں کبھی تعارض و تناقض نہیں ہوتا۔ کسی واقعہ کی جزئیات آپ جسقدر زیادہ سے زیادہ بیان کرتے چلے جائیں گے کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی جائیں گی۔ لیکن جو بات واقعہ کے خلاف گھڑی جائے گی اس کی جزئیات بیان کرتے وقت کہیں نہ کہیں سچی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے اسلئے کہ انسان کا حافظہ اتنا قوی نہیں ہوتا کہ وہ قدم قدم پر زندگی بھر اپنے تصنع کا خیال رکھ سکے۔ لہٰذا اس کی جزئیات میں آپ کو تعارض و تناقض کے بہت ہی بھونڈے نمونے نظر آئیں گے۔ ہماری تاریخ جس عہد میں مدون ہوئی ہے اس میں یوں بھی پروپیگنڈا اور ایکٹنگ کا فن اسقدر ترقی یافتہ نہیں تھا جتنا آج ہے۔ لہٰذا اگر روایت اور آزادیٔ رائے کے ساتھ اس ذخیرہ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں سے بھی حقائق کو زخارف سے الگ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ غلط عقیدت مندی اور جذبات سے بلند ہو کر حقائق کو چننے کی کوشش کی جائے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قربانیوں اور ایمان افروز نیک اعمالیوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ صحیح ہے کہ صحابہ میں فرق مراتب تھا لیکن بایں ہمہ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حضرات ذاتی اغراض کے ماتحت دیدہ و دانستہ اسلامی اصول کو قربان کر سکتے تھے۔ یقیناً ان سے اجتہاد میں غلطی ہو سکتی ہے۔ مسئلہ کو سمجھنے میں سہو ہو سکتا ہے مگر جانتے بوجھتے خلاف اسلام اعمال کا ارتکاب قرین عقل نہیں ہے۔

امیر معاویہؓ کو مطعون کرتے وقت ہم اس امر کو قطعاً فراموش کر جاتے ہیں کہ خود امیر معاویہؓ کی شخصیت کیا ہے؟ اسلام کے لئے ان کی خدمات اور قربانیاں کیا ہیں؟ صحابہ میں ان کا مرتبہ کیا ہے؟ وہ بھی ایک صحابی ہیں اور جلیل القدر صحابی۔

یہ صحیح ہے کہ امر خلافت میں حضرت امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ سے اختلافات رہے۔ جنگ و جدال تک نوبت پہنچی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ صحابہ میں حضرت علیؓ کا مرتبہ کافی بلند ہے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ اس کے لئے امیر معاویہؓ کو خود غرض اور جاہ پسند بنا دیا جائے۔

امیر معاویہؓ خود ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کا شمار ان کاتبین وحی میں ہوتا ہے جن کو سفرۃ کرام بررۃ (خوشنویس، شرافت کے مجسمے اور نہایت نیکوکار) کے القاب سے خود قرآن نے یاد کیا ہے۔ آپ حضرت ام المومنین ام حبیبہؓ کے بھائی تھے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے شام کے ایک حصہ کے گورنر تھے۔ ان کی سیاست و تدبیر اور اصابت رائے پر حضرت عمرؓ جیسا مدبر، بیدار مغز، بلکہ سخت گیر خلیفہ بھی آخر دم تک مطمئن رہا۔ آپ ہمیشہ ان کی تعریف کرتے رہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو پورے شام کا گورنر بنا دیا اور وہ بھی آخر دم تک ان پر اعتماد کرتے رہے۔ اتنے بڑے مرتبہ اور اعتماد کا شخص جو پورے چوبیس سال تک دونوں خلفاء کے عہد میں ہر آزمائش پر اس طرح پورا اتر چکا ہو کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دور خلافت

میں ہر ملک کے گورنر کو تبدیلیوں کا نشانہ بنا پڑا مگر یہ شخص اپنی جگہ پر ایسے اعتماد کا حامل رہا کہ کسی خلیفہ کو اس کے منصب یا مرتبہ میں تھوڑی سی تبدیلی کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو معمولی درجہ کا آدمی نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے شخص کے متعلق یہ بمشکل باور کیا جا سکتا ہے کہ اس نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہو گا۔ پھر امیر معاویہؓ کا

کبار صحابہؓ کو کیا ہو گیا تھا؟

زمانہ وہ زمانہ ہے جس میں بڑے بڑے صحابہ بکثرت موجود تھے۔ یہ وہ صحابہ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلعم کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی۔ جنھوں نے اپنے خون سے شجرِ اسلام کو سینچا تھا۔ جن کے درمیان میں خدائی وحی اترتی رہی تھی، جنھوں نے اپنے اعمال سے اس نظامِ خداوندی کو تشکل کیا تھا آخران تمام صحابہؓ کو کیا ہو گیا تھا کہ امیر معاویہؓ نے رسول اللہ اور خلفاء اربعہ راشدین کی سنت کو چھوڑ کر قیصر و کسریٰ کی سنت کو مسلمانوں میں زندہ کرنا چاہا اور وہ خاموشی کے ساتھ اس کو دیکھتے رہے؟ یہ وہی صحابہؓ تو تھے جو حضرت عمرؓ جیسے بارعب، بادبدبہ اور سخت گیر خلیفہ تک کو برسر ممبر ٹوک دیا کرتے تھے۔ اور جب تک وہ انھیں مطمئن نہیں کر دیتا تھا اس کا خطبہ تک سننے سے انکار کر دیا کرتے تھے اور انھیں کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم حق سے ذرا بھی ہٹو گے تو ہم نوکِ شمشیر سے تمہیں سیدھا کر دیں گے۔ یہ لوگ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایسے حق گو، حق پسند اور حق طلب تھے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر معاویہؓ کے سامنے جن کا حلم اور بردباری تاریخ اسلام میں ضرب المثل ہے اس طرح بھیگی بلی کیوں بن گئے؟ ان کی تلواریں کند اور ان کی زبانیں گنگ کیوں ہو گئیں۔ ان کی جرأت ایمانی کہاں چلی گئی؟ ان کی شہامت و شجاعت نے کیوں جواب دیدیا؟ اور وہ بھی ایک ایسے مسئلہ میں جو جزئی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ دین کا اصولی مسئلہ تھا۔

کہا جا سکتا ہے کہ چند نوجوان صحابہؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے سامنے ہی احتجاج کیا تھا۔ بعض نوجوان صحابہ ایسے بھی تھے جنھوں نے یزید بن معاویہؓ کے ہاتھ پر باوجود تحریص و ترغیب اور تخویف و ترہیب کے بیعت نہیں کی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ امیر معاویہؓ کے اس فعل کے خلاف کوئی آواز ہی بلند نہیں ہوئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ نوجوان کتنے تھے اور کون کون تھے، کیا یہ وہی نوجوان صحابہؓ نہیں تھے جو خود خلافت کے دعویدار اور خواہشمند تھے۔ جنھوں نے آگے چل کر خود اپنے لئے خلافت کی کوششیں کیں ان کی حیثیت محض ایک معترض کی نہیں تھی بلکہ ایک مدعی کی تھی۔ ان کے اعتراضات کو سامنے لاتے وقت اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

یزید کی خلافت کے لئے ان چند نوجوانوں کا بیعت نہ کرنا اگر اس کی خلافت کے لئے قدح بن سکتا ہے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے چند ہم خیال صحابہ کا چھ چھ ماہ تک بیعت نہ کرنا کیوں قدح نہیں ہے تعداد کے لحاظ سے یزید کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے والے اس تعداد سے کہیں کم ہیں جتنے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے والے تھے۔ پوری اسلامی تاریخ میں آخر وہ کونسا خلیفہ ہے جس کی بیعت کرنے میں چار پانچ آدمیوں نے پس و پیش نہ کیا ہو۔ اگر ہم اس اصول کو صحیح تسلیم کر لیں تو اسلام میں ایک خلافت بھی صحیح ثابت نہیں ہوتی حتی کہ خود خلفائے راشدین کی

خلافت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ بالخصوص حضرت علیؓ کی خلافت، جس کے خلاف صحابہؓ کی جماعت کا اتنا کثیر حصہ شمشیر بکف اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں جماعتیں میدانِ جنگ میں آگئیں۔

پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ کیا ان چند نوجوان صحابہ کے مقابلہ میں ہزاروں سینکڑوں دوسرے صحابہ نہیں تھے جو قطعاً اس بیعت کے حق میں تھے اور انتہائی شدت کے ساتھ اپنے خاندان اور اہل و عیال کو اتباع و پیروی کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ ہم ان چند نوجوانوں کے فعل کو دیکھیں گے یا ان سینکڑوں صحابہؓ کے عمل کو؟

چھوڑیئے ان نوجوانوں کو، سوال تو یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ اسوقت کہاں چلے گئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی کیوں کوئی آواز بلند نہیں کی۔ دینی اور شرعی مسائل میں جن کے ارشادات کو آج تک مشعلِ راہ بنایا جاتا ہے ان میں سے کوئی ایک صحابیؓ بھی ہمیں ان چند نوجوان صحابہ کا ہم نوا اور ہم خیال نظر نہیں آتا۔ بات در اصل یہ ہے کہ

چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

بہت سے دوسرے مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی ہماری تاریخ کا ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے جسے حل کرنے کی آج تک واقعی طور پر کبھی کوشش ہی نہیں کی گئی کیونکہ عقیدت مندیوں کے حجابات ایسا کرنے سے ہمیشہ مانع آئے اور ان حجابات کو دور کرنے کی آج تک کسی کو جرأت نہیں ہو سکی۔

مسئلہ کی اصل دینی حیثیت

موضوع زیر بحث پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ کی اصل دینی حیثیت کو سمجھ لیا جائے اور یہ کہ حضرات صحابہؓ کے عہد میں اس کو کس طرح سمجھا جاتا تھا۔ اس سے آئندہ گوشے خود بخود واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں ہم مصر کے مشہور مفکر علامہ طٰہٰ حسین کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

> اس سوال کا جواب دینے کے لئے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس حکومت (اسلامی نظام) کی طبیعت کیا ہے بعض لوگ جنھیں چند ظاہری امور سے دھوکہ ہو گیا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک قسم کا تھیا کریسی نظام تھا جو ہر امر میں ابتداءً و انتہاءً دین ہی پر اعتماد کرتا تھا اور چونکہ دین، سماوی اور منزل من اللہ تھا لہٰذا اس خیال کے لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ عہدِ نبوت و خلافت میں جو نظام مسلمانوں پر حکومت کرتا تھا اس میں حکومت و سلطنت کے ڈانڈے خدا اور صرف خدا ہی سے ملتے تھے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں خود لوگوں کا کوئی عمل دخل تھا ہی نہیں۔ نہ لوگ اس میں شریک تھے نہ انھیں اس پر کم و بیش اعتراض کرنے کا حق تھا۔ جو لوگ اس خیال کی طرف گئے ہیں ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے خدا کے حکم سے اس دولت کی بنیاد رکھی۔ خدا نے ہی اپنے نبیؐ کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ ایسے ہی خدا نے مکہ کے مسلمانوں کو بھی مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد خدا نے اپنے رسول پر مجمل اور مفصل احکام بھیجے اور پھر خدا نے ہی سورۃ والنجم میں یہ بھی فرما دیا کہ ما ضل صاحبکم وما غوی۔ و

مَا ینطق عن الھویٰ۔ ان ھوالا وحی یوحیٰ۔

اور خدا نے ہی مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ حتی کہ واضح طور پر یہ بھی فرما دیا کہ جب تک وہ اپنے باہمی جھگڑوں میں رسول کو حَکَم نہیں مانیں گے وہ مومن نہیں ہو سکتے۔ پھر اس کے بعد یہ اور اضافہ کر لیتے ہیں کہ ابوبکرؓ رسول اللہ کے خلیفہ تھے اور عمرؓ ابوبکرؓ کے خلیفہ تھے لہٰذا اب حکومت نبی صلعم سے اتر کر ان دونوں راشد اماموں کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ لہٰذا اس عہد میں نظام حکومت قطعاً تھیاکریسی کا ایک الٰہی اور خدائی نظام تھا۔ نہ کم نہ زیادہ۔

مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رائے صحت سے بہت ہی دور ہے۔ اسلام یقیناً ابتداءً اور انتہاءً ایک دین تھا جس نے لوگوں کو دینی اور دنیوی مصالح کی طرف متوجہ کیا اور ان کے لئے کچھ حدود و احکام متعین کر دیئے۔ سب سے اول توحید۔ دوم نبی کی تصدیق اور اس کے بعد اپنی سیرت میں خیر کا اتباع۔ لیکن اس نے انسانوں کی حریت فکر کو سلب نہیں کر لیا۔ ان کی قوت ارادہ کو معطل نہیں کر دیا۔ ان کے تمام معاملات پر قبضہ نہیں کر لیا۔ جو حدود اس نے متعین کر دی تھیں ان کے اندر انسانوں کی حریت کو اس نے مقید نہیں کر دیا۔ جو باتیں انسانوں کو کرنی چاہئیں یا نہ کرنی چاہئیں اس نے مخصوص طور پر متعین نہیں کر دیں بلکہ ان کے لئے عقلیں چھوڑیں کہ وہ ان سے خود غور و فکر کریں، ان کے لئے قلوب و اذہان چھوڑے کہ وہ سمجھیں اور سوچیں۔ ان کو اجازت دی کہ وہ مصالح عامہ اور مصالح خاصہ میں خیر و صواب کی پیروی کریں جہاں تک بھی ان کے لئے ممکن ہو سکے۔

خدا نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کیا کریں۔ اگر ہر حکم آسمان سے اترتا تھا تو نبی کا فرض تھا کہ وہ اپنے رب کے حکم سے اس کو نافذ کرتا نہ کسی سے مشورہ کرتا نہ کسی سے پوچھتا۔ یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے حالانکہ خدا کا صاف حکم موجود ہے۔ ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم وشاورھم فی الامر۔

اس کے بعد بہت سی ایسی مثالیں پیش کر کے جن میں رسول اللہ صلعم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا اور بعض مرتبہ اپنی مرضی کے خلاف بھی ان کے مشوروں کو قبول فرمایا۔ علامہ طٰہٰ حسین فرماتے ہیں:۔

اگر حکومت خدائی ہوتی جو ہر آن آسمان سے نازل ہوتی رہتی تھی تو مسلمانوں کے لئے کب یہ گنجائش ہو سکتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلعم کو ایسے امر پر مجبور کریں جو آپ نہیں چاہتے تھے۔ پھر تو کچھ بھی ہوتا آپ ان کا مشورہ قبول فرما ہی نہیں سکتے تھے

. . . .

اگر ہم ان تمام مواقع کا استقصاء کریں جن میں نبی صلعم نے اپنے اصحابؓ سے مشورہ فرمایا تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ لیکن یہ تھوڑے سے واقعات ہی یہ امر ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ حضور کے زمانے میں تمام تفصیلات آسمان سے نہیں اترتی تھیں بلکہ وحی دراصل نبی صلعم اور آپ کے اصحاب کو مصالح عامہ و خاصہ کی طرف رہنمائی کر دیتی تھی کہ حق اور خیر و عدل

کی حدود میں رہتے ہوئے وہ اپنے معاملات کا انتظام جس طرح چاہیں خود کریں۔ یہ نہیں تھا کہ وحی ان کی حریتِ فکر اور معاملات کے درمیان حائل ہو جاتی ہو

ہماری اس رائے کے لئے سب سے صحیح اور قطعی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم نے کہیں بھی سیاسی امور کی مجملاً یا مفصلاً کوئی تنظیم و تعیین نہیں کی ہے۔ انھیں صرف اتنا حکم دیا گیا ہے کہ وہ عدل کریں، احسان کریں، قرابت داروں کی امداد کریں — ضرورت مندوں کی خبر گیری کریں۔ فحشاء منکر اور بغی و عدوان سے باز رہیں۔ غرضکہ اس قسم کی عام حدود متعین کر دیں۔ پھر انھیں چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جس طرح چاہیں اپنے معاملات کا انتظام کریں۔ خود نبی صلعم نے اپنے مرض کی شدت کے وقت بھی اپنی سنت سے حکومت و سیاست کا کوئی نظام متعین نہیں کیا۔ ابوبکر صدیقؓ کو صرف نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے خود ہی کہا کہ رسولؐ اللہ نے چونکہ ان کو ہمارے دینی معاملہ کے لئے پسند فرمایا تھا لہذا ہم ان ہی کو اپنے دنیوی معاملات کے لئے بھی کیوں نہ پسند کر لیں۔ اگر مسلمانوں کے لئے کوئی سیاسی نظام آسمان سے اترا ہوا ہوتا تو اس کو قرآن متعین کر دیتا اور اس کے حدود و اصول کو نبی صلعم بیان فرما دیتے اور مسلمانوں کے لئے اس پر ایمان لانا اور اس پر یقین رکھنا فرض ہوتا۔ نہ پھر بحث و تمحیص کی کوئی گنجائش ہوتی نہ مجادلہ اور مناظرہ کی۔

(الفتنۃ الکبریٰ۔ عثمانؓ۔ طٰہٰ حسین ص۲۲-۲۵)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ

(I) اسلامی نظام ایک تھیاکریسی نظام نہیں تھا جس کے اصول و فروع وحی سے متعین ہو چکے ہوں۔

(II) اسلام انسان کی حریتِ فکر اور قوتِ ارادہ کو سلب نہیں کرتا۔

(III) وہ کچھ حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے معاملات کا انتظام اپنی صوابدید کے مطابق خود ہی کرتے ہیں جو خالص اپنے اجتہادات کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔

(IV) رسول اللہ صلعم نے بھی یہی کیا اور آپ کے بعد خلفاء راشدین اور عام جماعت مسلمین کا بھی طرزِ عمل یہی تھا۔

آپ نے دیکھا کہ فیصلہ کن چیز اس باب میں وحی الٰہی نہیں تھی، بلکہ رسول اللہ صلعم اور حضرات خلفائے راشدین اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صوابدید اور اجتہاد تھا۔ وحی الٰہی نے صرف حدود متعین کر دی تھیں جن کے اندر رہتے ہوئے تفصیلات کو متعین کرنا خود اسلامی معاشرہ کا کام تھا۔

اس کے بعد اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ اس عہد میں اسلامی معاشرہ قرآنی حدود کے اندر اپنی عقل و بصیرت ہی کے مطابق آگے قدم بڑھا رہا تھا۔ انسانی عقل و بصیرت کے لئے ہر حال کچھ حدود و ثغور ہیں۔ وہ زمانہ کے اقتضاآت اور ماحول کے اثرات ہی کے ساتھ ساتھ چل سکتی ہے۔ ایک ہی جست میں ارتقا کے نقطۂ آخریں تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ مختلف قسم کے تجربے کرتی ہے اور تجربے کرتے کرتے آہستہ آہستہ جانبِ منزل چلتی ہے۔ وحی اور انسانی عقل و بصیرت میں فرق ہی یہ ہے کہ وحی کا منصب

یہ ہے کہ وہ درمیان کے تمام حجابات کو ایک دم اٹھا دیتی ہے اور منزل کو بے نقاب کر کے پہلے ہی قدم پر سامنے لے آتی ہے مگر انسانی عقل و بصیرت کو یہ مقام حاصل نہیں ہے۔ وہ مختلف تجارب کے بعد بتدریج اس مقام تک پہنچتی ہے

وحی الٰہی نے صرف حدود کو متعین کر دیا اور جزئیات کو انسانی عقل و بصیرت پر کیوں چھوڑ دیا؟ یہ سوال ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے کہ خدا نے انسان کو انسان کیوں بنایا انھیں فرشتے کیوں نہیں بنا دیا۔ ہمیں صرف یہاں اتنا ہی دیکھنا ہے کہ مشیت الٰہی کا یہی منشا تھا کہ انسان، انسان ہی رہیں اور وہ اپنی عقل و بصیرت اور ارادہ و اختیار کی حریت کے ساتھ ارتقا کی منازل طے کریں۔ وحی کی مشعل ہاتھ میں لیکر اپنی منزل کی طرف قدم بڑھائیں اور عصری تقاضوں اور زمانی اثرات کے مطابق سعی و اجتہاد سے راستہ کی دشواریوں کو حل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ اگر کہیں قدم جادۂ اعتدال سے ہٹ جائیں تو چند منٹ کے لئے ٹھہر جائیں اور وحی کی روشنی میں اپنی قطع کردہ راہ پر نظر ثانی کر لیں۔ اگر کہیں غلطی ہوئی ہے تو اس کو درست کر لیں اور پھر جانب منزل روانہ ہو جائیں۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ اس کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ ہجرت کے قرن اول اور ساتویں صدی عیسوی کے واقعات کو آج کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ہمیں یہ حقیقت ہر وقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ہم فکر انسانی کے کس عہد کے متعلق بات کر رہے ہیں۔ دراصل ہم انسانیت کے اس عہد (Age) کے متعلق بات کر رہے ہیں جبکہ ملوکیت و شہنشاہیت تمام روئے زمین پر ایک مسلمہ کی حیثیت سے مسلط تھی۔ جمہوریت و خلافت کا وہ نظریہ اسوقت تک انسان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا جس کے تجربے کی اسلام نے بنیاد رکھی تھی۔ بقول سید طٰہٰ حسین

"نظم سیاسی و اجتماعی کا ارتقا اس عہد تک اپنی آخری منزل تک نہیں پہنچ سکا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آج تک بھی اپنی انتہا کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ عقل انسانی اپنے ارتقا کی آخری منزل تک نہ اسوقت پہنچ سکی تھی نہ آج تک پہنچ سکی ہے۔ جو لوگ آج بھی نظم سیاسی و اجتماعی کے متعلق مختلف نظریات میں باہمی تصادم و تخالف دیکھ رہے ہیں، انھیں کب یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات پر نکتہ چینی کریں جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں نظم سیاسی و اجتماعی کے بارہ میں رونما ہوئے۔ ایسا کرتے وقت یہ لوگ بالکل ہی بھول جاتے ہیں کہ وہ ہجرت کے قرن اول اور ساتویں صدی عیسوی کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ (الفتنۃ الکبریٰ ا۔ عثمانؓ صفحہ ۳۶)

اسلامی نظامِ مملکت ایک شورائی نظام ہے

ان تمہیدی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیکھئے کہ اسلام حکومت و سیاست کی بنیاد باہمی مشورہ پر رکھتا ہے۔ اسلامی نظام ایک شورائی نظام ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے ایک جامع حکم بیان فرما دیا ہے۔ یعنی

وامرھم شوریٰ بینھم۔

اور مسلمانوں کے معاملات حکومت ان کے باہمی مشورہ سے طے ہونا چاہئیں۔

قرآن کریم نے اس کے متعلق متعین طور پر کچھ تفصیلات نہیں دیں۔ رسول اللہؐ نے بھی اس کی جزئیات متعین نہیں فرمائیں۔ حضور اکرمؐ کے بعد مسلمانوں کو جب پہلی مرتبہ اس مشکل سے واسطہ پڑا تو انھوں نے اسی کلی اور اصولی حکم کی طرف مراجعت کی اور اسی کے

مطابق خلیفہ کا انتخاب کیا۔ نصب امام کے لئے آج تک اسی باہمی مشاورت کو ضروری قرار دیا جاتا رہا ہے۔ خواہ اس کی صورتیں مختلف رہی ہوں مگر روح سب میں یہی تھی۔ مشورہ پوری قوم کا ہو یا صرف اہل حل وعقد کا، یا محض کسی مرکزی مقام کے لوگوں کا، مگر تھا وہ بہرحال مشورہ ہی۔ جب تک خلافت اپنی صحیح صورت پر قائم رہی برابر اسی اصول کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے انتخاب کا واقعہ مشہور ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصارؓ کا جمع ہونا۔ مہاجرین کے اکابر کا وہاں جانا، بحث وتمحیص اور غور و فکر کے بعد ایک رائے پر متفق ہونا اور صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنا تاریخ کے مشہور واقعات میں سے ہے جن کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کو اگرچہ خود صدیق اکبرؓ نے نامزد فرما دیا تھا مگر اس نامزدگی سے وہ خلیفہ نہیں ہو گئے تھے۔ ملت نے متفقہ طور پر اس نامزدگی سے اتفاق کیا اور حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مسلمانوں کی اس بیعت ہی سے وہ خلیفہ بنے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے آخری وقت میں چھ حضرات میں خلافت کو محصور فرما کر ان کے مشورہ سے خلیفہ کے انتخاب کی وصیت فرمائی مگر امت اس کے لئے مجبور نہیں تھی کہ ان چھ آدمیوں کے سوا کسی آدمی کو منتخب کر سکے۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ امت میں بالاتفاق ان چھ آدمیوں سے بہتر کوئی آدمی موجود نہیں تھا اس لئے ملت نے اس وصیت کو منظور کیا اور اتفاق رائے سے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بہرحال حضرت عثمانؓ بھی بیعت عامہ کے بعد ہی خلیفہ بنے۔ محض حضرت عمرؓ کی وصیت نے ان کو خلیفہ نہیں بنا دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت ایسے حالات میں ہوئی کہ مدینہ منورہ پر بلوائیوں کا قبضہ واقتدار تھا۔ اہل مدینہ آزادیٔ رائے کے ساتھ کسی کو منتخب نہیں کر سکے۔ بلوائیوں نے زبردستی جس کو خلیفہ بنانا چاہا بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خلافت کا تمام عرصہ اسی باہمی اختلاف بلکہ کشت وخون میں گذر گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر حضرت علیؓ کا انتخاب رائے عامہ کے آزاد مشورہ سے ہوتا تو غالباً وہ خون خرابہ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔ تاریخ نے حضرت امام حسنؓ کے اس مشورہ کو محفوظ رکھا ہے جو اس وقت خلافت نہ قبول کرنے کے بارہ میں انھوں نے حضرت علیؓ کو دیا تھا۔

اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم اتنی بات جانتا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب باہمی مشاورت ہی سے ہوتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ جب خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر لیا گیا تب بھی اگرچہ ڈھونگ کے طور پر ہی سہی مگر بیعت عامہ اور مشورۂ عام کے مظاہروں کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اگرچہ ان کی روح فنا ہو چکی تھی اور محض رسم کے طور پر ہی ان کی ادائیگی کی جاتی تھی۔

بعض صحابہ نظام مملکت کو وراثتی سمجھتے تھے

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مسئلہ کہ امر خلافت شورائی ہے صحابہؓ کے درمیان اجماعی تھا۔ کیا تمام صحابہ اس پر متفق تھے کہ باہمی مشاورت سے خلیفہ کا انتخاب ہونا چاہئے یا اس میں کچھ اختلاف تھا۔ جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے یہ نظر آتا ہے کہ بنو ہاشم اور چند دیگر صحابہ اس کو شورائی کے بجائے موروثی سمجھتے تھے یعنی حضرت علیؓ اور حضرت عباس وغیرہ۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد حضرت علیؓ خلافت کے مستحق تھے۔ کیونکہ وہ رسول اللہ صلعم کے چچازاد بھائی اور آپ کے داماد تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم کی علالت ہی میں ان حضرات کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ

ضرورت ہو تو رسول اللہؐ سے تصریح کرالی جائے کہ آپ کے بعد آپ کا خلیفہ کون ہوگا؟ صحیح بخاریؒ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی یہ روایت موجود ہے کہ

اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی، علی ابن ابیطالبؓ رسول اللہ صلعم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابوالحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حال میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمدللہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے تو عباس بن عبدالمطلبؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لیگئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہوگے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہوجائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو، رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپ سے دریافت کرلیں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہوجائے گا اور اگر ہمارے سوا دوسرے لوگوں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہوجائے گا اور آپ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرمادینگے۔ (اس پر[1] حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہوسکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہوگا۔) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کردیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے ـــــ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۶۳۸)

مذکورہ بالا روایت سے آپ نے دیکھ لیا کہ ابھی حضور اکرم صلعم کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کی جانشینی کا سوال بنو ہاشم میں سے حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے دلوں میں پیدا ہونا شروع ہوگیا تھا مگر حضرت علیؓ اپنی جگہ پر مطمئن تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کے سوا کسی دوسرے آدمی کے دل میں اس کا خیال بھی پیدا نہیں ہوسکتا تھا مگر حضرت عباسؓ جو ان کی بہ نسبت زیادہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد معاملات کس راہ پر جائیں گے۔ انھوں نے حضرت علیؓ کو بروقت متنبہ کردیا اور چاہا کہ رسول اللہ صلعم سے اس بارہ میں کوئی تصریح کرالی جائے۔ اس پر حضرت علیؓ کا یہ جواب قابلِ غور ہے کہ "بخدا اگر ہم نے اس بارہ میں رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کردیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دینگے"۔ قابلِ غور ہے وہ محض اس اندیشہ کی وجہ سے رسول اللہ صلعم سے اس بارہ میں سوال کرنا نہیں چاہتے کہ کہیں حکومت کا امکان ہی ہمیشہ کے لئے ختم نہ ہوجائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلعم کا میلان بھی حضرت علیؓ ہی کی طرف ہوتا تو غالباً ایسی تصریح کرالینے کی ضرور کوشش کی جاتی۔ لیکن رسول اللہ صلعم کا میلان بجائے حضرت علیؓ کے حضرت صدیق اکبرؓ کی طرف نظر آرہا تھا چنانچہ اپنی جگہ نماز کی امامت کیلئے آپ کا صدیق اکبرؓ کو منتخب فرمانا اور بتکرار اس پر اصرار کرنا اسی طرف رہنمائی کرتا تھا۔ حضرت عائشہؓ اس تجویز کو بلطائف الحیل ٹالنا چاہتی ہیں مگر حضورؐ پھر بھی اسی پر اصرار فرماتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ اپنی وہی بات دوسرے عنوان سے حضرت حفصہ اور حضرت فاطمہؓ سے کہلواتی ہیں مگر حضورؐ پھر بھی اپنی اس تجویز کو واپس نہیں لیتے بلکہ سختی کے ساتھ فرماتے ہیں "تم تو یوسفؑ کی

---

[1] بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

ساتھیں معلوم ہوتی ہو۔ جاؤ ابوبکرؓ کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔" یہ تمام حالات حضرت علیؓ کی نظروں کے سامنے تھے اسلئے انھیں اس کا اندیشہ تھا کہ کہیں حضور اکرم صلعم صراحت کے ساتھ یہ نہ فرمادیں کہ خلافت بنو ہاشم میں نہیں ہوگی یا حضرت علیؓ خلافت کے حقدار نہیں ہیں۔ اگر خدانخواستہ صراحۃً آپ نے ایسا فرمادیا تو پھر کوئی مسلمان بھی بنو ہاشم میں سے کسی کو یا کم از کم حضرت علیؓ کو خلیفہ نہیں بنائے گا۔

رسول اللہ صلعم جہانِ فانی سے رحلت فرماگئے۔ آپ نے اپنے جانشین کے بارہ میں کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ امت کو پہلی مرتبہ امیر ملت کے انتخاب سے واسطہ پڑا۔ انصار کا خیال تھا کہ خلیفہ ان میں سے ہونا چاہئے اور مہاجرین کا خیال تھا کہ خلیفہ قریش میں سے ہونا چاہئے کیونکہ عرب قوم نئی نئی مسلمان ہوئی ہے اور ابھی تک اسلامی تعلیمات ان کے قلوب میں کما حقہ راسخ نہیں ہوئیں لہٰذا وہ قریش کے سوا کسی دوسرے قبیلہ کی سیادت کو تسلیم نہیں کرے گی۔ یہ بات انصار کی بھی سمجھ میں آگئی اور سقیفہ بنی ساعدہ میں اور پھر مسجد نبوی میں ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت عامہ کرلی گئی مگر بنو ہاشم نے جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ پیش پیش تھے، صدیق اکبرؓ سے طویل عرصہ تک بیعت نہیں کی۔ اس موضوع پر علامہ محمد حسین ہیکل (مشہور مصری مفکر) حضرت صدیق رضؓ کی بیعت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

صدیق اکبرؓ سے بیعت میں حضرت علیؓ اور بنو ہاشم کا موقف

کیا یہ بیعت عامہ مسلمانوں کی طرف سے اجماعی تھی جس میں کوئی بھی پیچھے نہ رہا ہو جیسا کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت خاصہ کے وقت سعد بن عبادہؓ پیچھے رہ گئے تھے؟ مشہور یہی ہے کہ کبار صحابۂ مہاجرین میں سے کچھ لوگ بیعت میں شریک نہیں ہوئے۔ اور بنو ہاشم میں سے ان متخلفین میں علی ابن ابی طالب اور عباس بن عبدالمطلب بھی تھے۔ یعقوبی نے بیان کیا ہے کہ مہاجرین و انصار میں سے ایک جماعت نے ابوبکرؓ سے بیعت نہیں کی اور ان کا میلان علی بن ابی طالبؓ کی طرف تھا۔ ان میں عباسؓ بن عبدالمطلب، فضل ابن عباس، زبیر ابن العوام ابن العاص، خالد بن سعید، مقداد بن عمر، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، براء بن عازب اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

ابوبکرؓ نے عمر بن الخطاب، ابوعبیدۃ ابن الجراح اور مغیرۃ بن شعبہ سے ان لوگوں کے بارہ میں مشورہ کیا۔ انھوں نے حضرت صدیقؓ کو عباس ابن عبدالمطلبؓ سے ملاقات کرنے کا مشورہ دیا۔ . . . . . .

چنانچہ ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا۔ صدیق اکبرؓ نے اپنی طویل گفتگو میں حضرت عباسؓ سے کہا — ہم آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ اس امر خلافت میں آپ کا حصہ بھی ہونا چاہئے جو آپ کو اور آپ کی اولاد کو برابر ملتا رہے کیونکہ آپ بہرحال رسول اللہ کے چچا ہیں۔ یعقوبی نے حضرت عباسؓ کی گفتگو کو بیان کرتے ہوئے ان کا یہ جواب نقل کیا ہے۔

"اگر حکومت ہمارا حق ہے تو ہم اس پر راضی نہیں کہ کچھ لیں اور کچھ چھوڑ دیں۔"

ایک روایت میں یہ بھی موجود ہے جسے یعقوبی اور دوسرے بہت سے مورخین نے نقل کیا ہے اور یہ روایت آج تک برابر مشہور

چلی آرہی ہے کہ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت حضرت فاطمہؓ کے مکان میں حضرت علیؓ کے پاس جمع ہوئی جو حضرت علیؓ کو بیعت کرنا چاہتی تھی ان میں خالد بن سعیدؓ بھی تھے جنھوں نے فرمایا۔ "خدا کی قسم! لوگوں میں کوئی بھی محمدؐ کی جانشینی کا تم سے زیادہ حقدار نہیں ہے۔"

ابوبکرؓ و عمرؓ کو حضرت فاطمہؓ کے مکان میں ان لوگوں کے اجتماع کی خبر ہوئی تو وہ ایک جماعت کے ساتھ وہاں پہنچے . . . . حضرت علیؓ شمشیر بدست باہر نکلے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پکڑ کر پچھاڑ دیا اور ان کی تلوار توڑ ڈالی اور یہ لوگ مکان کے اندر گھس گئے۔ حضرت فاطمہؓ نکلیں اور انھوں نے پکار کر کہا۔ "خدا کی قسم! تم لوگ یا تو باہر نکل جاؤ ورنہ میں اپنے بال پراگندہ کرکے خدا کے سامنے فریاد و زاری اور بد دعا کروں گی۔" حضرت فاطمہؓ کی اس دھمکی پر گھر میں جس قدر لوگ تھے سب ایک دم باہر نکل گئے۔ یہ لوگ کچھ دن تک تو یوں ہی رہے پھر یکے بعد دیگرے آہستہ آہستہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرتے چلے گئے۔ مگر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے انتقال تک ـــ یعنی چھ ماہ تک ـــ بیعت نہیں کی اور ایک روایت کے مطابق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہیں چالیس روز کے بعد انھوں نے بیعت کر لی تھی . . . .

حضرت علیؓ اور بنو ہاشم کے تخلف کے بارہ میں جو روایت سب سے زیادہ مشہور اور شائع و ذائع ہے یہ وہ روایت ہے جسے ابن قتیبہ نے (اپنی کتاب) الامامۃ والسیاسۃ میں بیان کیا ہے۔ اسے اور اسی قسم کی دوسری روایتوں کو ان کے معاصرین اور متاخرین نے بھی بیان کیا ہے وہ روایت یوں ہے کہ حضرت عمرؓ ایک جماعت کے ساتھ ابوبکرؓ کی بیعت کی تکمیل کے بعد بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ باہر نکل کر جیسا کہ تمام لوگوں نے بیعت کر لی ہے وہ بھی بیعت کر لیں۔ بنو ہاشم اس وقت حضرت علیؓ کے مکان میں مجتمع تھے۔ بنو ہاشم اور ان کے تمام ہمنواؤں نے عمرؓ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ زبیر بن العوامؓ ہاتھ میں تلوار لئے عمرؓ اور ان کے ساتھیوں کی طرف نکلے۔ عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کو پکڑ لو چنانچہ لوگوں نے ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور انھوں نے جاکر بیعت کر لی۔ علی ابن ابی طالبؓ سے کہا گیا کہ ابوبکرؓ سے بیعت کر لو۔ علیؓ نے جواب دیا۔ میں تم سے بیعت نہیں کر سکتا۔ تمہاری بہ نسبت میں امر خلافت کا زیادہ حقدار ہوں اور تم لوگوں کو مجھ سے بیعت کرنا چاہئے۔ تم لوگوں نے یہ امر خلافت انصار سے لیا ہے اور نبی صلعم کے ساتھ اپنی قرابت کو استدلال کیا ہے۔ تم لوگ اہل بیت سے خلافت کو غصباً چھیننا چاہتے ہو۔ کیا تم نے انصار سے یہ نہیں کہا کہ تم ان کی بہ نسبت خلافت کے اس لئے زیادہ حقدار ہو کہ محمدؐ تم ہی میں سے تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے تمہیں قیادت و امامت سونپ دی؟ لہٰذا اب میں بھی تمہارے خلاف اسی دلیل سے استدلال کرتا ہوں جس دلیل سے تم نے انصار کے مقابلہ میں استدلال کیا تھا۔ ہم زندگی اور موت ہر دو حال میں رسول اللہ سے زیادہ قریب ہیں۔ اگر تم میں ایمان ہے تو انصاف سے کام لو۔ ورنہ اس ظلم کے نتیجہ کیلئے تیار رہو اور وہ نتیجہ تم جانتے ہو۔

حضرت عمرؓ نے کہا۔ "جب تک تم بیعت نہ کر لو تمہیں یوں نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

حضرت علیؓ نے گرمی اور شدت کے ساتھ جواب دیا: "اونٹنی کا دودھ دوہ لو آدھا تمہیں مل جائے گا اور آج اس کا تھن باندھ کر چھوڑ دو تاکہ باقی کل کو مل جائے۔

ابوبکرؓ کو ڈر ہوا کہ ان کی تیز کلامی کہیں شدت اختیار نہ کرلے لہٰذا وہ دونوں کے بیچ میں آگئے اور حضرت علیؓ سے انہوں نے فرمایا: "اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس کے بعد ابوعبیدہ بن الجراح حضرت علیؓ کے پاس گئے اور نرمی سے ان کو سمجھایا اور کہا: "بھیا! تم نوعمر ہو۔ یہ لوگ تمہاری قوم کے بوڑھے ہیں، نہ تمہیں ان جیسا تجربہ ہے نہ معاملات کی پہچان ہے۔ میں یقیناً یہ سمجھتا ہوں کہ امر خلافت کیلئے ابوبکرؓ تم سے زیادہ قوی، اہل اور موزوں شخص ہیں۔ لہٰذا اس امر کو تم ان ہی کے حوالہ کردو۔ اگر تم زندہ رہے اور تمہاری عمر نے وفا کی تو اس میں شبہ نہیں کہ تم فضل، دین، علم، فہم، سبقت اسلام، نسب اور قرابت کے اعتبار سے ہر طرح اس کے اہل ہو۔"

اس پر حضرت علیؓ برافروختہ ہو کر بولے: "مہاجرین کی جماعت! اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو۔ عرب پر محمد کی سلطنت کو اس کے گھر اور اس کے مخزن سے نکال کر اپنے گھروں اور اپنے حفاظت خانوں میں نہ لیجاؤ اور سلطنت والوں کو ان کے مقام اور حق سے نہ ہٹاؤ۔ خدا کی قسم اے مہاجرین! ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ ہم اہل بیت ہیں اور جب تک ہم میں کتاب اللہ کے پڑھنے والے، اللہ کے دین کی سمجھ رکھنے والے۔ رسول اللہؐ کی سنتوں کو جاننے والے، امر رعیت کا لحاظ رکھنے والے، ان سے برائیوں کو دور کرنے والے، ان کے درمیان مساوات کے ساتھ اموال کو تقسیم کرنے والے موجود ہیں۔ ہم ہی امر خلافت کے مستحق ہیں۔ خدا کی قسم خلافت ہم ہی میں ہے، تم لوگ خواہشات کی پیروی کرکے اللہ کی راہ سے گمراہ نہ ہو جاؤ کہ اس طرح تم حق سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔

رواۃ کا بیان ہے کہ بشیر بن سعد اس گفتگو کے وقت موجود تھے۔ انہوں نے یہ باتیں سنیں تو انہوں نے کہا۔ اے علیؓ! اگر انصار نے یہ باتیں ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلینے سے پہلے سن لی ہوتیں تو وہ کبھی تمہارے بارہ میں اختلاف نہ کرتے۔

حضرت علیؓ یہاں سے غصہ میں بھرے ہوئے نکلے اور رات کے وقت حضرت فاطمہؓ کو ایک سواری پر سوار کرکے ساتھ لیا اور انصار کی مجالس میں گھومنا شروع کردیا۔ حضرت فاطمہؓ نے انصار سے مدد مانگی تو وہ جواب میں کہتے تھے۔ اے رسول اللہؐ کی صاحبزادی! ہم اس شخص (ابوبکر) کے ہاتھ پر بیعت کرچکے ہیں۔ اگر تمہارا شوہر اور چچیرا بھائی ابوبکرؓ سے پہلے آجاتا تو ہم اسے ہرگز نہ چھوڑتے۔

حضرت علیؓ کا غصہ اس جواب پر اور بھی تیز ہوگیا اور انہوں نے جواب دیا: "کیا میں رسول اللہؐ کو بلا دفن گھر میں چھوڑ کر چلا آتا اور سلطنت کیلئے لوگوں سے جھگڑتا پھرتا؟"

اس پر حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں: "ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کچھ کیا جو اُن کو زیبا تھا۔ اور لوگوں نے وہ کچھ کیا جس کا وہ خدا کو جواب اور حساب دیں گے۔

حضرت علی ابن ابیطالبؓ اوران کے اصحاب کا موقف ابوبکرؓ کی بیعت کے متعلق یہ کچھ مشہور ہے۔

(الصدیق ابوبکرؓ ص۷۱-۷۴) (محمد حسین ہیکل)

صحیح بخاری سے ان تاریخی تفاصیل کی تائید

اس طویل اقتباس کو ہم نے اسلئے نقل کردیا ہے تاکہ واقعہ کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ اس اقتباس پر ہم کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہمیں صرف اسی قدر دیکھنا ہے کہ بنو ہاشم کا یہ خیال تھا کہ امر خلافت موروثی ہے، شورائی نہیں ہے۔ صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت خاصہ اور بیعت عامہ کی تکمیل ہوجانے کے بعد بھی ان حضرات کی طرف سے برابر اس کے خلاف کوششیں ہوتی رہیں حضرت علیؓ کا مکان ان کوششوں کی آماجگاہ تھا۔ ان واقعات کی تائید صحاح کی روایات سے بھی ہوتی ہے چنانچہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔

حضرت فاطمہؓ نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کردیا اور ان کے انتقال کی ابوبکرؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوگیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں۔ تو اب انھوں نے ابوبکرؓ سے صلح کرلینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انھوں نے بیعت[۵۱] نہیں کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جاسکیں گے۔ اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا۔ تم کیا سمجھتے ہو، وہ میرا کیا کرلیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا[۵۲] ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو آپ کو حق تعالیٰ عطا فرمائے ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ[۵۳] ہے۔

. . . . . .

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکر صدیقؓ ممبر پر چڑھے، خطبہ دیا اور بیعت علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر

---

۵۱ بعینہ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انھوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ اور کیا ہے۔ معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو زہری نے جواب دیا کہ نہیں۔ نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی حتیٰ کہ چھ ماہ بعد جب حضرت علیؓ نے بیعت کرلی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کرلی۔ (ابن جریر طبری ج۲ ص۴۴۸)

۵۲ ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقعہ پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کرلیا تھا۔ (ابن جریر ص۴۴۸ ج۲)

۵۳ ابن جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولکنا کنا نری ان لنا فی ھذا الامر حقا فاستبددتم بہ علینا یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ابن جریر طبری ج۲ ص۴۴۸)

انھوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حق عظمت کا بیان کیا اور کہا کہ انھوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے انکار کی بنا پر جو خدا نے انھیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امر خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابوبکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔　　(صحیح بخاری جزو ۲ صفحہ ۶۰۹)

صحیح بخاری کی اس روایت سے مندرجہ ذیل حقائق ہمارے سامنے آ گئے:

(۱) حضرت فاطمہؓ کو رات کو دفن کیا گیا اور صدیق اکبرؓ کو انتقال کی اطلاع نہیں دی گئی تاکہ وہ شریک نہ ہو جائیں۔

(۲) حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار تھا مگر ان کے انتقال کے بعد انھوں نے محسوس کر لیا کہ اب لوگوں کے چہرے بدل گئے ہیں۔

(۳) جب تک حضرت فاطمہؓ بقید حیات رہیں حضرت علیؓ نے بیعت نہیں کی۔

(۴) حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد صدیق اکبرؓ کو پیغام بھیجکر بلوایا مگر یہ شرط تھی کہ وہ تنہا آئیں۔ حضرت عمرؓ کو ساتھ نہ لائیں۔

(۵) حضرت عمرؓ ابوبکر صدیقؓ کے تنہا جانے میں خطرہ محسوس کرتے تھے چنانچہ [illegible] کیران کو روتے ہیں۔

(۶) حضرت علیؓ تنہائی میں بھی اور علانیہ مسجد نبوی میں بھی جہاں صدیق اکبرؓ کے فضائل کا اعتراف کرتے ہیں وہاں اس چیز کو پھر دہراتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم سے قرابت کی بنا پر امر خلافت میں ان کا حصہ تھا اور ابوبکر صدیقؓ پر خلافت قبول کرکے بنی ہاشم کے خلاف استبداد کا الزام لگاتے ہیں۔

حضرت علیؓ کا چھ ماہ بعد بیعت کر لینا بھی تبدیلیٔ رائے کی بنا پر نہ تھا

بخاری کی اس روایت کے بعد جو باقی صحاح میں بھی موجود ہے ان تمام تفصیلات میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی جو اس سے پچھلے اقتباس میں دی گئی ہیں بخاری کی اس روایت سے یہ چیز بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علیؓ نے چھ ماہ کے بعد صدیق اکبرؓ کے ہاتھوں پر اس لئے بیعت نہیں کی کہ اب ان پر اپنی رائے کی غلطی واضح ہو گئی تھی بلکہ بیعت کرتے وقت بھی وہ اس امر کا صاف صاف اعلان کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلعم کی قرابت کی بنا پر وہ اپنے آپ کو امر خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے یا امام بخاریؒ کے نہایت محتاط الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ "امر خلافت میں وہ اپنا حصہ سمجھتے تھے"۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ امر خلافت کوئی ایسا امر نہیں ہے جس میں پانچ چھ آدمی حصہ دار ہو سکیں۔ خلافت ساجھے کی ہانڈی نہیں ہوتی جس میں ابوبکر صدیقؓ اور علی مرتضیٰؓ شریک شریک سمجھے جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا مآل وہی ہے جو امام طبری نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ قرابت نبوی کی وجہ سے اپنے کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔ لہٰذا صدیق اکبرؓ سے چھ ماہ بعد بیعت کر لینا کسی رائے کی تبدیلی کی بنا پر نہیں تھا بلکہ امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق اس لئے تھا کہ حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک عام لوگوں میں ان کا اعزاز و وقار قائم تھا اور انھیں یہ امید رہی کہ وہ اپنے اس حق کو (جو ان کے خیال میں ان سے چھینا گیا تھا) واپس لے سکیں گے لیکن حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد لوگوں کی

نگاہیں بدل گئیں، اور اب وہ امید باقی نہیں رہی جو اس وقت تک قائم تھی۔ لہٰذا ان کے لئے بیعت کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ مگر اس بیعت کر لینے کے بعد بھی حضرت علیؓ نے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ امر خلافت میں ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے خلفاء کے ساتھ کوئی عملی تعاون نہیں کیا۔ انھوں نے رسول اللہ صلعم کے بعد کسی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ حتیٰ کہ مرتدین، منکرین زکوٰۃ، اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب جیسی خلاف اسلام شورشوں اور فتنوں میں بھی وہ الگ رہے، جبکہ دوسرے بڑے بڑے صحابہ ہر ہر محاذ پر داد شجاعت دے رہے تھے۔ جنگ بدر میں ولید بن عتبہ جیسے پہاڑ کو پچھاڑ دینے والا، خیبر کا نامور نوجوان فاتح جس کی رگوں میں ہاشمی خون آج بھی اسی تیزی کے ساتھ گردش کر رہا تھا جس تیزی کے ساتھ رسول اللہ صلعم کے عہد ہمایوں میں گردش کرتا تھا، یوں گوشہ نشین ہو جائے۔ یہ بلا وجہ نہیں تھا۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بیعت کے بعد حضرت علیؓ نے اپنا خیال بدل لیا تھا کہ وہ خلافت کے وراثتاً حقدار تھے۔ (باقی آئندہ)

رابطۂ باہمی

جنوری ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ مختلف شہروں کے قارئین طلوع اسلام ایک دوسرے سے تعارف اور رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف مقامات سے جن حضرات نے اس کے لئے اپنے نام پیش کئے وہ گذشتہ اشاعتوں میں شائع کئے جاتے رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اکثر اہم مقامات پر قارئین طلوعِ اسلام آپس میں ایک دوسرے سے برابر متعارف ہوتے جا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا قدم

یہ ہے کہ جن جن مقامات قارئین طلوع اسلام ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے اور رابطۂ باہمی قائم کر چکے ہیں وہ اپنے اپنے مقام پر "بزم طلوعِ اسلام" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر لیں اور تمام قارئین کسی ایک مقام پر جمع ہو کر اپنے میں سے کسی ایک معتمد علیہ شخص کو اپنی بزم کا "ترجمان" منتخب کر لیں۔ بزم طلوع اسلام قائم ہو جانے اور ترجمان کا انتخاب ہو جانے کے بعد یہ ترجمان اپنے مقام کی بزم کے متعلق ادارۂ طلوع اسلام کو اپنی رپورٹ بھیجدے اور آئندہ سے یہ ترجمان ادارۂ طلوع اسلام سے براہِ راست رابطہ قائم رکھے۔

اسی سلسلہ میں اگلا قدم یہ ہے کہ جہاں جہاں بزم طلوع اسلام قائم ہو چکی ہے وہاں بزم کی طرف سے فوراً ایک دارالمطالعہ قائم کیا جائے اور ضرورت ہو تو احباب کو مطالعہ کے لئے طلوع اسلام کا لٹریچر عاریۃً بھی مہیا کیا جائے۔ اس ضمن میں ہم ہر مقام کی بزم سے خود بھی ہر ممکن تعاون کرینگے۔ اس سلسلہ میں باقی ہدایات ہر مقام کے ترجمان کو ادارہ سے بھیجی جاتی رہیں گی۔ والسلام

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

کیا اسلام میں

نظامِ جاگیرداری وزمینداری

کی

گنجائش ہے

(سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

(۲)

مدینہ منورہ میں بنی حارثہ کے زمینداروں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور احکام جب پہنچے اور بعد کو مختلف الفاظ اور تعبیروں میں ان ہی کی اشاعت مسلمانوں میں ہوئی، ان سے اور کچھ نہیں تو یہی فائدہ کیا کم تھا کہ ظالمانہ چیرہ دستیوں کی سندِ جواز جو انسانی رسم ورواج کے زیرِ اثر زمینداروں کو دنیا میں حاصل تھی، کم ازکم ان کا تو اسلامی عہد میں قطعاً انسداد ہوگیا، ہوا، روشنی فضا وغیرہ جیسے قدرتی مظاہر میں خاک کا یہ تودہ بھی شریک ہے اور وہی نوعیت مٹی کے اس ڈھیر کی بھی ہے؛ جو کائنات کے دوسرے قدرتی آثار کی ہے۔ الغرض

"الارض ارض اللہ"

کا صحیح مطلب کیا ہے، اس کی یافت جیسی کہ چاہئے لوگوں کو ہوئی یا نہ ہوئی، لیکن اتنی بات بہرحال تسلیم کرلی گئی کہ دوسرے معاملات میں جیسے کہ دھوکہ فریب، ظلم وزیادتی اور ان خطرات کا اسلام نے انسداد کردیا ہے جن سے رگڑے جھگڑے پیدا ہوں۔ اسی طرح زراعت اور کھیتی باڑی کے سلسلے میں بھی معاملہ کی ان تمام صورتوں کو اسلام نے ناجائز ٹھہرادیا ہے، جن میں ان ہی امور کا اندیشہ ہو گویا سمجھا گیا کہ جو حال دوسرے معاملات اور کاروبار کے دوسرے طریقوں کا ہے وہی حال مزارعت کا بھی ہے کوئی خاص مزیت یا امتیاز دوسرے عام معاملات کے مقابلہ میں اس کو حاصل نہیں ہے۔ دوسری صدی کے مشہور مصری امام لیث بن سعد کا یہ قول مزارعت کے باب میں امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، یعنی لیث بن سعد کہتے تھے کہ

الذی نھی عن ذلک مالو نظر فیہ ذووالفھم بالحلال والحرام لم یجیزوہ لما فیہ من المخاطرۃ (جلد ۵ ص۷)

مزارعت کے سلسلہ میں جو ممانعت آئی ہے یہ ایسی بات ہے کہ حلال اور حرام کے سمجھنے والوں میں جو بھی غور کرے گا، اس کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ اس میں بربادی کا خطرہ ہے۔

* مخاطرہ کے لفظ کا حاصل معنی جو میں نے درج کیا ہے، یہ شرح اس کی حافظ ابن حجر نے کی ہے، آگے وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

هذا موافق لما علیه الجمهور من حمل النهی عن کراء الارض علی الوجه المفضی الی الغرر والجهالة (فتح الباری ج۵)

یعنی لیث کے اس قول کا وہی مطلب ہے جو عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کی ممانعت کا مطلب ہے کہ دھوکا اور فریب، جہالت کی صورتیں کرایہ کے جن طریقوں میں پیش آسکتی ہیں، ان ہی سے منع کیا گیا ہے۔

سچ پوچھئے تو اسی کو بنیاد قرار دیکر مزارعت کے تمام مروجہ ظالمانہ طریقوں کو ناجائز اور حرام ٹھہراتے ہوئے صرف دو صورتیں یعنی نقدی بندوبست بالفاظِ دیگر مقرر رقم فی ایکڑ طے کرکے زمین کا مالک زمیندار کسانوں کو بندوبست کرے، ایک تو یہ اور دوسری شکل یہ کہ غلہ کی مقررہ مقدار نہ طے کی جائے بلکہ جو کچھ بھی پیدا ہو اُس کا آدھا یا تہائی یا چوتھائی حصہ زمیندار لے گا۔ مزارعت کے معاملہ میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں میں انہی دو صورتوں کا دروازہ کھلا رہ گیا اور یوں زمینداری کا قصہ نہ ختم ہوسکا۔ اگرچہ اسلامی قوانین کی تدوین جن بزرگوں نے انجام دی ہے، ان کی اہم مرکزی ہستیوں کے نزدیک جیسا کہ ابن حزم کے حوالہ سے نقل کرچکا ہوں ان دونوں صورتوں کے جواز کی بھی گنجائش اسلام میں نہ تھی، ائمہ مجتہدین میں سب سے زیادہ اس مسئلہ پر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اصرار مشہور ہے لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ باوجود اس اصرار کے اُن کی پیش قیاسی یہ بھی تھی کہ

ان الناس لایأخذون بقوله (شامی جلد ۴ ص۲۲)

لوگ میرے قول کو عملاً اختیار نہ کریں گے۔

خود ان کی یہ پیش قیاسی ان کی عقلی بصیرت کی دلیل ہے وہ دیکھ رہے تھے کہ رسم ورواج کی زنجیروں میں کسی کسائی ہوئی دنیا الارض ارض اللہ (زمین خدا کی زمین ہے) اس کا جو صحیح مطلب ہے، ابھی اس کے سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے، عموماً قاعدہ ہے کہ ارادہ او خواہش کے بعد کرنے والے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کی تصحیح وجواز کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ ان کو مل ہی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اسی قسم کا واقعہ اس مسئلہ میں بھی پیش آیا۔

پہلی شکل یعنی نقدی بندوبست کے جواز میں کچھ تو حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان سے لوگ مستفید ہوئے، عرض کرچکا ہوں کہ بنی حارثہ کے جن زمینداروں نے براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زمین کے بندوبست کرنے کی ممانعت کا حکم سنا تھا ان کا تو انتقال ہوچکا تھا۔ رافع ہی اس خاندان کے آخری نمایندے تھے جو اپنے بزرگوں، چچا اور ماموں وغیرہ سے سنی ہوئی روایتوں کا دوسروں سے ذکر فرماتے تھے، عرض کرچکا ہوں کہ ان سے نقدی بندوبست کے متعلق جب پوچھا گیا تو یہ کہتے ہوئے کہ اس زمانہ میں بندوبست کے اس طریقہ کو لوگ نہیں جانتے تھے، پھر اپنی رائے کبھی یہ دیتے تھے کہ اس میں بظاہر کوئی مضائقہ نہیں، مگر ان ہی سے لوگ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ لوگوں کو اس سے منع کرتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مطلقاً زمینوں کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے منع کردیا ہے تو چاہئے کہ نقدی بندوبست کے طریقہ کو بھی چھوڑ دیا جائے، ظاہر ہے کہ کرنے والے جس کام کو کرنا چاہتے ہیں، ان کیلئے اتنا سہارا بھی کافی ہوگیا، اسی کے ساتھ مسلمانوں میں ایک روایت دوسرے صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہوکر پھیلی کہتے ہیں کہ حضرت سعد فرماتے تھے:۔

ارخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی کراء الارض بالذھب والورق

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے کہ سونے اور چاندی (یعنی نقد) کرایہ میں زمین بندوبست کی جائے۔

ان ہی کی طرف دوسرے الفاظ میں یہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھیتی کے کاروبار کرنے والوں کا جھگڑا ایک دفعہ پیش ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے سے ممانعت کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ

اکروا بالذھب والفضۃ

سونے اور چاندی (یعنی نقد پر) زمین کو بندوبست کیا کرو۔

نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ دونوں روایتیں کس زمانہ میں مشہور ہوئیں لیکن حافظ ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس وقت یہ دونوں روایتیں جس سند کے ساتھ کتابوں میں پائی جاتی ہیں، دونوں ہی کی سند میں سخت قابل اعتراض اور غیر معتبر راویوں کے نام ملتے ہیں، لکھا ہے کہ ایک روایت کی سند میں تو عبدالملک بن حبیب الاندلسی کا نام ہے۔

وھو ھالک

اور یہ شخص (روایت کے لحاظ سے) مردہ ہے۔

خصوصاً اس شخص کی ایسی حدیثیں جنھیں اپنے ہم نام عبدالملک بن الماجشون سے روایت کرتا ہے بلکہ ابن حزم نے اندلسی کے سوا خود ابن الماجشون کو بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی طرح دوسری سند میں ابن حزم کا بیان ہے کہ محمد بن عبدالرحمٰن بن لبیبہ کا نام ہے۔

وھو مجھول لا یدری[1]

غیر معروف آدمی ہے، کچھ نہیں معلوم کہ کون ہے، حالات اس کے کیا ہیں۔

بہرحال نقدی بندوبست کے لئے تو خیر ایک دو روایتیں خواہ ان کی نوعیت کچھ ہی ہو مل بھی جاتی ہیں، تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ بٹائی یعنی نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار پر بندوبست کرنے کے طریقہ کے جواز میں لوگوں کو جب کچھ نہیں ملا تو اب اسے کیا کہئے کہ جس کی کسی حیثیت سے قیاس درست نہ تھا یعنی حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کو زمین بندوبست کرکے خراج اور ٹیکس جو لگایا جاتا تھا یعنی ریونیو وصول کیا جاتا تھا۔ خود رسول اللہ نے خیبر کے نخلستانوں اور زرعی زمینوں کو یہودی کاشتکاروں اور باغبانوں کے ساتھ بندوبست کرکے خراج مقاسمہ لگا دیا تھا یعنی بجائے نقدی کے پیداوار ہی کا ایک حصہ خراج میں لیا جائے گا۔ حضرت معاذ بن جبل یمن کے والی بن کر رسول اللہ کی طرف سے اس علاقہ میں آئے اور وہاں کی زمینوں کو حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کے ساتھ جو بندوبست کیا تھا، یا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں خراج مقاسمہ پر حکومت کی طرف سے زمینیں جو بندوبست ہوئی تھیں، بندوبست کا یہی طریقہ حکومت کی طرف سے عہد نبوت اور عہد خلافت میں جو اختیار کیا گیا تھا، اسی کو

---

[1] تفصیل کیلئے محلی ابن حزم ج ۸ ص ۲۶۳ کا مطالعہ کیا جائے اسی موقعہ پر انھوں نے اس پر بھی تنقید کی ہے کہ رافع بن خدیج نقدی بندوبست کی اجازت دیتے تھے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس اجازت کو منسوب کرتے تھے۔

نظیر بنا کر سمجھ لیا گیا، کہ زمین کے مالک زمیندار بھی اپنی زمینوں کو پیداوار ہی کے نصف یا چوتھائی پر کیوں بندوبست نہیں کر سکتے۔

حکومت جو زمین کے آباد کاروں سے ان ہی کے امن و امان آرام و آسائش، فلاح و بہبود اور یہ کہ ان کے امیروں سے لیکر غریبوں میں تقسیم کرنے کے لئے خراج یا مالگذاری وصول کرتی ہے، اس پر زمینداروں کی اس آمدنی کو قیاس کرنا جو کاشتکاروں کے لئے نہیں بلکہ اپنے عیش و آرام اور طمطراق ترک و احتشام میں خرچ کرنے کے لئے لیتے ہیں، یہ سمجھنا کہ دونوں کی نوعیت ایک ہی تھی، بھلا اس کا کیا جواب دیا جائے۔ مبسوط میں شمس الائمہ سرخسی نے یہ لکھ کر کہ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کیا تھا۔ حکومت کے امام ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ اور

للامام رای فی الارض الممنون بها علی اهلها ان شاء جعل علیها خراج الوظیفة وان شاء جعل علیها خراج المقاسمة (مبسوط ج ۲۳ صـ)

جو زمینیں زمینوں پر کام کرنے والوں کے حوالہ کر دی گئی ہوں، یہ امام (حکومت) کی صوابدید پر ہے، کہ چاہے ان زمینوں پر خراج وظیفہ (نقدی ٹیکس) لگائے چاہے خراج مقاسمہ (پیداوار کا کچھ حصہ وصول کرے)

درمیان میں دوسرے مسائل کا تذکرہ کر کے آخر میں لکھا ہے کہ بیت المال (حکومت کا خزانہ) کی آمدنی جو امام یعنی حکومت کا نمائندہ کاشتکاروں سے وصول کرتا ہے۔ اس پر مسلمانوں کے باہمی معاملات کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ یعنی مسلمان کاشتکار کو زمین کا مالک اپنی زمین بندوبست کر کے اسی طرح پیداوار کا کچھ حصہ وصول کرے، جیسے خیبر کے کاشتکاروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصول کرتے تھے صحیح نہ ہوگا ان کے الفاظ ہیں

لا یجوز مثله فیما بین المسلمین فیضعف من هذه الوجه استدلالهم بمعاملة رسول الله علیه وسلم معهم (ص)

نہیں جائز ہوگا یہ معاملہ خود باہم مسلمانوں کے درمیان، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ ان کے ساتھ یعنی یہودی کاشتکاروں کے ساتھ کیا اس سے استدلال کرنا ان لوگوں کا صحیح نہ ہوگا (جو زمینداروں کیلئے بھی اس معاملہ کو جائز سمجھتے ہیں۔

طرفہ تماشا اس سلسلہ کا یہ ہے کہ خیبر میں جو معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کاشتکاروں سے کیا تھا، اسی کو نظیر بنا کر زمینداری کے بٹائی والے اس خاص طریقہ کو جائز قرار دینا چاہتے تھے، ان کے لئے ایک بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ مختلف ذریعوں سے یہ حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو کر پھیلی ہوئی تھی کہ مخابرت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، مخابرت کا مطلب کیا ہے؟ بہت سے لوگوں کا خیال تھا جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے بھی مبسوط میں نقل کیا ہے کہ

هذا الاشتقاق من معاملة رسول الله صلی الله علیه وسلم مع اهل خیبر فسمیت مخابرة بالاضافة الیهم (مبسوط ج ۲۳ صـ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا، اسی معاملہ کو مخابرہ خیبر کی نسبت سے کہتے ہیں۔

مخابرہ کی اس شرح کی بنیاد پر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز سے خود منع کیا ہو، اسی پر آپ خود کیسے عمل کر سکتے تھے، اسی وجہ سے بعض لوگوں نے مخابرہ کے اشتقاق کی مذکورہ بالا توجیہ کا انکار کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ عربی زبان میں

کاشتکار کو خبیر بھی کہتے تھے۔ اور بعضوں نے کہا کہ

الخبیرۃ النصیب وقیل من الخبار الارض اللینۃ (ص ۲۲۷ ج ۱)

الخبیرہ حصہ کو کہتے ہیں بعض اسکو خبار سے مشتق بتاتے ہیں جس کے معنی نرم زمین کے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب واقعی عربی زبان کے یہ محاورے تھے بھی یا نہیں یا اس کی حیثیت نکتہ بعد الوقوع کی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے عربی لغت کے مشہور اور مستند امام ابن الاعرابی کے حوالہ سے اسی مخابرہ کے لفظ کی لغوی تحقیق کے سلسلے میں جو یہ الفاظ نقل کئے ہیں:۔

ان اصل المخابرۃ معاملۃ اہل خیبر فاستعمل ذلک حتی صار اذا قیل خابرہم عرف انہ عاملہم نظیر معاملۃ اہل خیبر۔ (فتح الباری ص ۔ ج ۵)

اہل خیبر کے معاملہ کو مخابرہ کہتے تھے اور یہ لفظ عام طور پر استعمال ہونے لگا اور مخابرہ کا مطلب یہ ہونے لگا کہ اہل خیبر کے جیسا معاملہ اس نے کیا۔

اس سے تو غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ خود ساختہ تعارض کے وسوسہ کو مٹانے کیلئے بطور نکتہ بعد الوقوع کے مخابرہ کا ماخذ خبیر یا خبرہ یا خبار وغیرہ الفاظ کو قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ اصل حقیقت وہی ہے کہ یہ لفظ خیبر ہی کی طرف منسوب ہو کر بنا۔ البتہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ خیبر میں کیا تھا اس معاملہ کا نام مخابرہ پڑا اور صحیح کیسے ہو سکتا ہے بقول ابن حزم

ان خیبر کان ھذا اسمہا قبل مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان المخابرۃ کانت تسمی بھذا الاسم کذلک۔ (ص ۱۱۹)

خیبر کا نام خیبر ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے پہلے تھا اور اسی خیبر کی طرف منسوب ہو کر "مخابرہ" کا نام مشہور ہوا۔

اسی بنیاد پر جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے غیر معمولی برہمی کے ساتھ ان لوگوں کو جھڑکا اور ڈانٹا ہے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ خیبر والوں کے ساتھ کیا اسی کا نام مخابرہ تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

ان النہی عن المخابرۃ (عن اعطاء الارض بما یخرج منہا کان قبل خیبر بلا شک۔

مخابرہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت اور زمین کو اس کی پیداوار کے کسی حصہ پر بندوبست کرنا اس معاملہ کا نام مخابرہ ہے، یہ دونوں باتیں فتح خیبر کے بعد والے معاملہ سے پہلے کی ہیں۔

بلکہ انہی شہادتوں کی بنیاد پر میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ زمین کو بندوبست کرکے کچھ کئے دھرے بغیر آمدنی حاصل کرنے کا وہ طریقہ جسے زمینداری کہتے ہیں، یعنی زمین کے خاص رقبہ کی ملکیت کا حق اپنی طرف کسی ذریعہ سے منسوب کرکے بااطمینان محنت کرنے والوں کی محنت سے استفادہ اور غریب کسانوں پر من مانے شروط اس سلسلہ میں عائد کرکے اپنی پوزیشن کو حتی الوسع خسارے اور آفات سے محفوظ کرلینا، عرب جیسے غیر زرعی ملک کے باشندے آمدنی حاصل کرنے کے اس طریقے سے شاید آشنا نہ تھے، ان کے پاس زرعی زمینیں تھیں کہاں؟ اور کہیں دیہات اور نخلستانوں میں تھیں بھی، تو وہ اتنی کم مقدار میں تھیں کہ خود کاشت کرنے والوں کے لئے کافی نہ تھیں، اسی لئے تھوڑی بہت کاشت جو وہاں ہوتی بھی تھی، خصوصاً حجاز میں تو دست خود دہان خود ہی کے طریقہ پر ہوتی تھی لیکن سرمایہ کے

زور پر زمین کے کسی رقبہ کا مالک بن کر آمدنی حاصل کرنا کچھ تعجب نہیں کہ خیبر کے یہودیوں ہی نے عربوں کو اس سے ابتداءً روشناس کیا ہو، اسی لئے اس طریقہ کا نام بھی مخابرہ ہوگیا۔ ابن الاعرابی کے الفاظ سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے۔

تاریخوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے اطراف و نواح نیز خیبر وغیرہ میں قلعے کے نام سے یہودیوں کے جو خاص مراکز قائم تھے، دراصل ان قلعوں کی حیثیت ساہوکارہ کی کوٹھیوں اور غلوں کے گوداموں کی تھی، مختلف ذرائع سے یہودی سرمایہ دار غریب عربوں کو چوستے رہتے تھے، حد یہ تھی کہ علاوہ روپے کے سونے چاندی کے زیور بھی یہودی سرمایہ دار کرایہ پر چلایا کرتے تھے۔ سیر کبیر کی شرح میں علامہ سرخسی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کرایہ کے زیوروں یا برتنوں میں سے ایک زیور یا برتن مکہ میں ضائع ہوگیا جس کے تاوان میں دس ہزار اشرفیاں وصول کی گئیں (ج ۱ص ۱۸۶، شرح سیر کبیر)

معلوم ہوتا ہے کہ زمینوں کو کرایہ پر دے کر من مانے طریقے سے کاشتکاروں کی کمائی کا بڑا حصہ یہودی سرمایہ دار اڑا لیا کرتے تھے اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ عموماً عرب کے حاجت مند لوگ ان سے زیادہ تر غلہ ہی قرض لیا کرتے تھے۔ کعب بن اشرف اور رافع بن ابی الحقیق کے قتل کے قصوں میں پڑھئے۔ ہر ایک میں آپ کو یہی ملے گا کہ ان یہودی سرمایہ داروں سے اناج ہی طلب کیا گیا تھا جو رہن رکھ کر دیا کرتے تھے، بعض موقعوں پر پتہ چلتا ہے کہ غریب عربوں کے بیوی اور بچوں تک کو یہودی سرمایہ دار گرو رکھ لیا کرتے تھے۔

بہرحال زمین کے مالکوں اور زمینداروں کا، اپنی زمین کرایہ پر بندوبست کر کے آمدنی وصول کرنے کا یہ طریقہ، مزارعت کے سوا مخابرہ کے لفظ سے بھی سمجھا جاتا تھا، میرے خیال میں تو خود اس لفظ میں بھی زمینداری کی کچھ تاریخ پوشیدہ نظر آتی ہے، اور ملکوں کا تو میں نہیں کہتا، لیکن سرزمین عرب یا کم از کم حجاز کی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہودی سرمایہ داروں ہی نے عرب کے محنت کش باشندوں کے ساتھ یہ کھیل کھیلنا شروع کیا تھا، سود اور ربا کے مختلف طریقوں سے جو کچھ وہ کر رہے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ مزارعت کی راہ سے بھی تقریباً اسی قسم کے سرمایہ دارانہ مظالم کے پہاڑ ان کے سروں پر توڑ رہے تھے، بعض روایتوں میں جو آیا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخابرہ کا ذکر کر کے فرماتے کہ

من لم یذر المخابرۃ فلیأذن بحرب من اللہ ورسولہ (کنز العمال بحوالہ ابوداؤد و مستدرک حاکم ص ۳۴۲ جلد ۸)

جو مخابرہ کے معاملہ کو نہ چھوڑے، چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اعلان جنگ دیدے۔

لہجہ بتا رہا ہے کہ "مخابرت" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سرمایہ داری کا وہی زہر نظر آ رہا تھا جو ربا اور سود کا مخصوص زہر ہے[1]۔ اور قرآن میں جس کی ممانعت کا حکم دیتے ہوئے یہی فرمایا گیا ہے کہ جو سود خواری سے باز آنا نہیں چاہتا وہ اللہ اور اس کے رسول کو اعلانِ جنگ دیدے۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ حکومت اور زمین کے حقیقی آبادکاروں کے درمیان سے بجبر قبضہ کرنے والے متسلطین و متغلبین کا نکال باہر کرنا بھی اس جنگی اور حربی کشمکش کا بقول شاہ ولی اللہ واقعی نصب العین تھا جو ایران و روم کی شاہنشاہیتوں سے کی گئی تھی، یہی نقطۂ نظر خیبر

---

[1] بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کاشت کرنے والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ محنت اور تخم تو میری طرف سے ہے اور زمین دوسرے صاحب کی ہے۔ نصف حصہ پیداوار کا زمین والے کو ملے گا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اربیتما (تم دونوں نے سودی معاملہ کیا) اور اس کے بعد معاملہ کو فسخ کر دیا، (دیکھو جمع الفوائد جلد ۱، ص ۲۵۰) مشکل الآثار میں طحاوی نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

کی قلعہ کشائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہ تھا؟

یہودی کاشتکاروں اور کسانوں کو ان کے سرمایہ داروں سے آزاد کر کے خیبر کی زرعی زمینوں اور نخلستانوں کو ان ہی کے ساتھ جو بندوبست کردیا گیا تھا[۱]، بظاہر آپ کے اس طرزِ عمل سے یہی سمجھ میں بھی آتا ہے۔

باب معاملۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اھل خیبر (یعنی اہل خیبر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ کیا تھا اس کی نوعیت کیا تھی)، امام بخاریؒ نے اس باب کو قائم کر کے جو حدیث اس باب میں درج کی ہے وہ صرف یہی ہے کہ

اعطی النبی صلی اللہ علیہ وسلم خیبر الیھود ان یعملوھا ویزرعوھا ولھم شطر ما یخرج منھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو یہ طے کرتے ہوئے دیا کہ وہی خیبر کی زمینوں پر کام کریں اور ان میں کھیتی کریں جو پیدا ہو اس کا ایک حصہ ان کو ملے گا۔

دراصل یہ وہی یہودی تھے جن کے متعلق حدیثوں میں آیا ہے کہ اپنے پھاوڑوں اور اپنی ٹوکریوں کے ساتھ باہر نکلے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس فوج (خمیس) پر ان کی نظر پڑی جو آپ کے ساتھ تھی، محمد والخمیس کہتے ہوئے بھاگے، بخاری وغیرہ کی روایتیں اس سلسلہ میں قابلِ توجہ ہیں یعنی ایک طرف تو معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کی سرمایہ داروں کے پاس بڑا خزانہ تھا لیکن دوسری طرف صحابہ بیان کرتے ہیں کہ

لم نغنم ذھبا ولا فضۃ (بخاری)

غنیمت میں ہم لوگوں کو نہ سونا ملا اور نہ چاندی۔

دونوں روایتوں کے ملانے سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ زر و نقرہ کا سارا سرمایہ تو چند خاص سرمایہ داروں یعنی وہی آل ابی الحقیق میں محدود و منحصر تھا

---

[۱] چند خاص یہودی سرمایہ دار جن میں ایک کعب بن اشرف یہودی کے سوا، آل ابی الحقیق ہی کے افراد تھے۔ آل ابی الحقیق کے یہودی خاندان کی خصوصیت ہی یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہودی سرمایہ کا اکثر و بیشتر حصہ عن الاکابر فالاکابر من آل ابی الحقیق (یعنی اسی خاندان کے بڑوں سے بڑوں میں منتقل ہوتا چلا آتا تھا) بڑے عیش کی زندگی گذارتے تھے، رافع بن الحقیق کی گڑھی اور گڑھی میں اسکی محل سرا، محل سرا کا بالاخانہ جس پر جانے کیلئے بجائے اینٹوں کی سیڑھی کے لکھا ہے کہ چوبی زینہ بنا ہوا تھا رات کو اس کے یہاں سامرہ (گپ بازی قصہ خوانی) کی محفلیں جمتی تھیں، محفل والے جب رافع کے دسترخوان پر پُرتکلف کھانے کھا کر گھر واپس ہوتے، تب بالاخانہ پر اپنی بیوی کے ساتھ جا کر سوتا، کچھ یہی رنگ کعب بن الاشرف کا تھا، ان سرمایہ داروں کا حال یہ تھا کہ خود سنگھ مسلمانوں کے سامنے مقابلہ کرنے کیلئے نہ نکلتے تھے، نہ نکل سکتے تھے، البتہ اپنے سرمایہ کے زور پر قبائلِ عرب کے بھوکوں ننگوں کو کٹوانے چلے جاتے تھے، لکھا ہے کہ اعان غطفان وغیرھم من القبائل من مشرکی العرب بالمال الکثیر علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی غطفان اور ان کے سوا دوسرے عرب کے جاہلوں کی مدد رسول اللہ کے مقابلہ میں زرِ کثیر صرف کرتے تھے (دیکھو فتح الباری ج ۸ ص ۲۷) سچ پوچھئے تو لاکھوں لاکھ انسانوں کے خون اور جان کی ضمانت ان چند سرمایہ داروں کی موت میں پوشیدہ تھی، افسوس ہے کہ یورپ کے مورخین ان چند سرمایہ دار یہودیوں کے قتل کے واقعہ کو غیر معمولی رنگ آمیزیوں کے ساتھ بیان کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کے ساتھ یہ ظلم تھا بر عکس نہند نام زنگی کا فور اسی کو کہتے ہیں، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ خیبر کے سرمایہ داروں سے چھین کر وہاں کے اصلی کاشتکاروں اور کسانوں کے ساتھ زرعی زمینوں اور نخلستانوں کو رسول اللہ صلعم نے بندوبست تو کر دیا تھا لیکن فرما دیا تھا کہ یہ دوامی بندوبست نہیں ہے، یہودی قوم کی خصوصیت ہے کہ کسی حال میں ہو، غیر یہودی قوموں کا کینہ ان کے دل سے نکل نہیں جا سکتا۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

دوسروں کو اس کی خبر بھی نہ تھی اور خیبر کے باشندوں کے پاس سونے چاندی کی شکل میں تھا ہی کیا جو مالِ غنیمت میں ہاتھ آتا۔

بہرحال مخابرہ یعنی خیبر کے سرمایہ دار یہود نے زمیندارانہ طریقہ سے زمینوں کے بندوبست کرنے کی رسم سے عرب کو آشنا کیا تھا۔ اسی مخابرہ کو ختم کرنے کیلئے جو اقدام کیا گیا اور خیبر کو فتح کرکے زمین کے اصلی آبادکاروں اور حکومت کے درمیان سے سرمایہ دار زمینداروں کو نکال کر زمین کے واقعی کسانوں اور حقیقی باغبانوں کے سپرد وہاں کی زمین کر دی گئی، حکومت کی طرف سے بندوبست کرنے کے اسی طریقہ کو دیکھکر مخابرہ یعنی زمینداری کی کل شکلوں کو تو نہیں لیکن اسی مخابرہ کی ایک خاص صورت کے جواز کی سند بنائی گئی، یعنی قرار دیدیا گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیداوار کے کچھ حصہ پر خیبر کی زمین بندوبست فرمائی تھی تو زمینداروں کو بھی اس کا حق کیوں حاصل نہ ہوگا کہ اسی شرط پر اپنی زمینوں کو بندوبست کریں، ایسا ہونا چاہئے تھا یا نہ ہونا چاہئے لیکن ہوا یہی۔

کچھ بھی ہو زمینداری کے اور ظالمانہ اور جابرانہ طریقوں کا تو بہرحال انسداد ہوگیا، صرف نقدی بندوبست اور جو کچھ پیدا ہوا ہو، اس کا نصف اور ثلث زمیندار کو ملے گا۔ ان دونوں کے متعلق اختلاف باقی رہا، شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے:۔

کان الخلاف فی الصدر الاول والتابعین رحمہم اللہ بعدھم واشتبہت الآثار عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ج ۲۳ ص ۹)

صدر اول (یعنی عہدِ صحابہ ہی میں اختلاف رہا) اور ان کے بعد تابعین کی رائیں بھی اس باب میں مختلف رہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرکے جو باتیں بیان کی گئیں ان میں اشتباہ پیدا ہوگیا۔

شمس الائمہ کی پہلی بات یعنی صدر اول (عہد صحابہ) اور تابعین کے زمانہ میں مسئلہ زمینداری کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہوسکا اور لوگوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اس کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا، کتابوں میں طرح طرح کے نظریات اس باب میں نقل کئے جاتے ہیں جن کی تفصیل موجبِ تطویل بھی ہے اور شاید ان کے تذکرہ سے کچھ فائدہ بھی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کے متعلق بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم واقفیت کی وجہ سے کچھ دنوں تک اپنی زمین بٹائی پر دوسرے بندوبست کرتے رہے لیکن جب تحقیق سے ثابت ہوا کہ بنی حارثہ کے زمینداروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اپنی زمین کرایہ پر نہ بندوبست کیا کریں تو اس کاروبار کو انھوں نے چھوڑ دیا اسی کے ساتھ بخاری وغیرہ میں ہے کہ کافی تعداد صحابیوں کی بٹائی پر اپنی زمین کو بندوبست کرتی رہی، روایت کے ظاہر الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکاروں کو کاشت کے لئے اپنی زمین دیدیا کرتے تھے، اپنی محنت اور اپنے مصارف سے کاشتکار ان زمینوں کو آباد کرتے تھے، پھر جو کچھ پیدا ہوتا تھا حسب معاہدہ نصف یا تہائی چوتھائی پیداوار کا زمین کے مالک یعنی زمیندار کو دے دیا کرتے تھے، گویا بجنسہٖ بٹائی سسٹم جس کا زمینداروں میں اب تک رواج ہے، زمینوں کے بندوبست کرنے کا یہی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اسی کا ردعمل یہ ہے کہ قوموں میں بھی یہ مبغوض ہیں، ان کی قومی مصیبت خود ان کی اس قومی خصوصیت میں پوشیدہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب بھی کیا گیا ہے کہ تہائی میں کسی مسلمان کو یہودی پائے اور اس کے قتل کی بات دل میں نہ کرے، یہ نہیں ہوسکتا (مبسوط ص ۷) بہرحال اسی وجہ سے جب یہودیوں کی طبعی شرکینگی کا مسلسل تجربہ ہوا تو عہد فاروقی میں خیبر سے ان کو باہر کر دیا گیا اور تیما دار بجا اور دوسرے اسلامی علاقوں میں جاکر بس گئے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے معاوضہ دیکر یہودیوں سے زمین خالی کرائی تھی۔ (دیکھو فتح الباری ص ۹۰ ج ۵)

طریقہ جاری تھا (دیکھو کتاب المزارعۃ صحیح بخاری باب المزارعۃ بالشطر)

لیکن جن صحابیوں کی طرف بندوبست کرنے کے اس طریقۂ کار کو روایت میں منسوب کیا گیا ہے ان میں ہم ان صحابیوں کو بھی پاتے ہیں جن سے براہ راست یا بالواسطہ تلمذ و استفادہ کا تعلق رکھنے والے ارباب فتویٰ کسی شرط پر بھی زمینوں کے بندوبست کرنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے ان صحابیوں میں حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شمار کیا گیا ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ کوفہ کے فقہاء کو اور اسلامی قوانین کی تدوین کے کام کرنے والے ائمہ ابن مسعود اور حضرت علی (رضی اللہ عنہما) کے زیادہ تر اپنے فقہی نظریات میں پابند ہیں، امام ابوحنیفہؒ کی فقہ تو ابن مسعودؓ ہی کی فقہ سمجھی جاتی ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان ہی جیسے دوسرے لوگ یہ جانتے ہوئے کہ ابن مسعودؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی زمینوں کو بٹائی پر بندوبست کیا کرتے تھے، اس کے عدم جواز کا فتویٰ کیسے دے سکتے تھے۔

امام بخاریؒ نے اسی باب میں ٹھیک اسی کے بعد یعنی بٹائی پر صحابیوں کی کافی تعداد اپنی زمین بندوبست کرتی تھی، آگے سلف کے بعض بزرگوں کے طریقۂ عمل کی وضاحت ان الفاظ میں بھی کی ہے۔ مثلاً ابن سیرین کے متعلق یہ روایت درج کی ہے کہ

کان لا یری باساً ان یدفع ارضہ الی الاکار علیٰ ان یعمل فیھا بنفسہ وولدہ واعوانہ ویقرہ ولا ینفق شیئاً وتکون النفقۃ کلھا من رب الارض

ابن سیرین اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے کہ زمین کسان کو اس شرط پر دی جائے کہ وہ خود اور اس کے بال بچے اور متعلقین کھیت پر کام کرینگے بیل بھی اسی کا ہوگا مگر کاشتکاری کے مصارف (تخم آبپاشی وغیرہ) کی ذمہ داری زمین کے مالک زمیندار کے سر رہے گی۔

ظاہر ہے کہ زمینداروں میں بٹائی پر زمینوں کے بندوبست کرنے کا جو عام طریقہ ہے اس سے ابن سیرین کا مندرجہ بالا فتویٰ بالکل مختلف ہے۔ زمینداروں کی بٹائی میں تو سب کچھ کاشتکار ہی کو کرنا پڑتا ہے، کاشت کے سارے مصارف اسی پر عائد ہوتے ہیں، زمیندار کی طرف سے صرف زمین سے استفادہ کا حق دیا جاتا ہے اور اسی حق کے معاوضہ میں پیداوار کا کچھ حصہ زمیندار حاصل کرتا ہے۔

لیکن آپ دیکھ رہے ہیں ابن سیرینؒ تو محنت مزدوری کی ذمہ داری صرف کاشتکار پر عائد کرتے ہیں لیکن سینچائی تخم وغیرہ کے سارے مصارف کا بار رب الارض (یعنی زمیندار) ہی کے سر ڈالتے ہیں۔

اور اس باب میں تنہا ان ہی کی یہ رائے نہ تھی، امام بخاری نے ہی اسی کے ساتھ خواجہ حسن بصری کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

قال الحسن ان تکون الارض لاحدھما فینفقان جمیعاً فیما خرج فھو بینھما (ج ۳ ص ۹)

حسن بصری کہتے تھے کہ زمین کا مالک ایک شخص ہو، وہ اور کاشتکار دونوں مل کر کاشتکاری کے مصارف کا بار اٹھائیں اور جو کچھ پیدا ہو دونوں میں بانٹ دیا جائے، اس طریقۂ کار میں بھی حرج نہیں ہے۔

الغرض یہ بٹائی والا طریقہ نہ ہوا، بلکہ "مشترکہ کاشت" کی گویا ایک شکل ہوئی، جس میں زمیندار یعنی رب الارض کی طرف سے زمین کے سوا کاشت کے مصارف بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔

میں قطعی طور پر تو نہیں کہہ سکتا، لیکن ابن سیرینؒ اور حسن بصری کے ان نقاط نظر کی روشنی میں بظاہر خیال اسی طرف جاتا ہے کہ

نصف ثلث ربع پیداوار پر زمینوں کے بندوبست کرنے کے جس طریقہ کو روایتوں میں بعض صحابہ کرام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کی نوعیت زمینداروں والی بٹائی کی عام شکل سے مختلف تھی۔

اور یہ دعویٰ اگر کیا جائے کہ بٹائی نہیں بلکہ مشترکہ کاشت کے طریقہ کی راوی نے مجمل تعبیر کر دی ہے تو بظاہر اس دعویٰ کو بے بنیاد نہیں ٹھہرایا جا سکتا آخر صحابیوں کے طرزِ عمل کے ہوتے ہوئے کوئی وجہ ہو سکتی تھی کہ ابن سیرین، حسن بصری اور وہی کیا ابن حزم کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ اسلامی شہروں کے عام فقہاء ارباب فتویٰ یعنی اسلامی قوانین کے مدون کرنے والے حضرات صحابہؓ کے بعد مسلمانوں میں جو گذرے ان کی مرکزی ہستیاں کسی شرط پر بھی نقدی ہو، یا بٹائی زمینوں کو بندوبست کرنے کی اجازت زمین کے مالکوں یعنی زمینداروں کو نہیں دیتے تھے، صحابہ کرام کے عملی نمونوں سے ان کا نہ متاثر ہونا اور جس کام کو صحابہ کرامؓ کرتے ہوں، اس کو ناجائز ٹھہرانے کی جرأت خود سوچنا چاہئے کہ وہ کیسے کر سکتے تھے۔

بہرحال شمس الائمہ نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رسولؐ اللہ کے بعد اختلاف اس مسئلہ میں ضرور پیدا ہوا، ائمہ مجتہدین کے آراء بھی اس باب میں اسی وجہ سے مختلف ہیں جس کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے لیکن شمس الائمہ کا دوسرا دعویٰ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آثار اور احادیث اس باب میں جو منسوب ہیں خود ان میں بھی اشتباہ پیدا ہو گیا تھا۔

چھوٹا منہ بڑی بات ہے، شمس الائمہ بہرحال شمس الائمہ ہیں، بایں ہمہ اپنے محدود معلومات کی بنیاد پر اپنے اس احساس کو میں کیسے چھپاؤں کہ جہاں تک اس سلسلہ میں براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں اور آپ کے آثار کا فقیر نے اب تک جائزہ لیا ہے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، فقہاء کی کتابوں اور حدیث کی کتابوں، ان کی شرحوں میں ڈھونڈتا رہا ہوں، مجھ پر تو یہی واضح ہوا ہے کہ حافظ ابن حزم کی تعبیر:۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کراء الارض جملۃ

یعنی زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً اور کلیۃً ممانعت فرما دی۔

اس کے ذکر سے صحاح ستہ اور حدیث کی عام کتابیں بھری ہوئی ہیں، کسی قسم کا اجر و معاوضہ خطا اور حصۂ زمین کا مالک اس شخص سے نہیں لے سکتا۔ جسے اپنی زمین کرایہ پر اس نے دی ہے اس کے لئے حدیث کی جس کتاب کو اٹھا لیجئے، بکثرت اجمالی اور تفصیلی روایتیں آپ کو ملتی چلی جائیں گی، دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ کلیۃً "سد باب المزارعۃ" یعنی الغائے زمینداری کے محکم وثائق سے کتابیں معمور ہیں لیکن اس کے برعکس یہ مسئلہ کہ زمین کا مالک زمیندار کرایہ پر اپنی زمین کو بندوبست کر کے آمدنی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے جواز میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ والی وہ مجروح روایت جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقدی بندوبست کی اجازت دی ہے، بس اس کے سوا لے دیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قطعی قولی فرمان "یعنی کرایہ پر زمینوں کو بندوبست نہ کیا کرو" اس قول کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل، یعنی خیبر کے یہودی کاشتکاروں کے ساتھ حکومت کی طرف سے وہاں کی زرعی زمینوں اور نخلستانوں کو جو آپ نے بندوبست کیا تھا، ہر پھر کر جو بھی ذکر کرتا ہے بس آپ کے اسی طرزِ عمل کو پیش کرتا ہے اور اسی کو

پیش کرکے کراء الارض کی کلی ممانعت والے نبوی فرمانوں کی تخصیص کا دعویٰ کر دیا جاتا ہے۔

میں نے جہاں تک تلاش کیا خیبر والے عملی نمونہ کے سوا کسی کے پاس اور کچھ نہیں ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بعد یہ دعویٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والے آثار میں اشتباہ پیدا ہو گیا کہاں تک بجا دعویٰ ہو سکتا ہے، کم از کم شمس الائمہ جو خود لکھ چکے ہیں کہ خیبر والا معاملہ تو حکومت اور کاشتکاروں کے درمیان تھا، کاشتکاروں سے خراج مقاسمہ وصول کیا جاتا تھا اس پر زمینداروں کی آمدنی کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا، تفصیلاً اس کی بحث گزر چکی ہے، بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ یہودی سرمایہ داروں کو درمیان سے نکال کر خیبر کی زرعی زمینوں اور نخلستانوں کو واقعی اُن پر کام کرنے والوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بندوبست کرنا، مخابرہ یعنی زمینداری کے جس طریقہ کو یہودی سرمایہ داروں نے عرب میں رواج دیا تھا، اسی پر گویا یہ عملی ضرب لگائی گئی تھی، لیکن اب اس کو کیا کیجئے کہ حکومت جب کاشتکاروں سے محصول اور مالگذاری وصول کرتی ہے تو زمینداروں کو بھی کاشتکاروں سے اپنی زمین کی مالگذاری وصول کرنے کی کیوں اجازت نہ دی جائے گی، اسی مع الفارق قیاس کا یہی نتیجہ چل پڑا اور بات واضح نہ ہو سکی۔

تاہم جو کچھ آپ پڑھ چکے اس کے بعد بھی اگر کوئی نتیجہ تک نہ پہنچے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ درحقیقت پہنچنے سے گریز کر رہا ہے۔

اور یہ تو خیر مسئلہ کا منفی پہلو تھا، یعنی زمین کے مالکوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ کرایہ پر اپنی زمینوں کو بندوبست نہ کریں، لیکن پھر اپنی زمینوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں، کیا مسئلہ کے اس ایجابی و اثباتی پہلو کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشنہ چھوڑ دیا تھا؟ صرف بخاری ہی میں آپ کو سب کچھ مل جائے گا، اس سلسلہ کی ایک مشہور روایت تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من کانت لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ فان ابی فلیمسك ارضہ

جس کے پاس زمین ہو، چاہئے کہ اس زمین پر خود کاشت کرے، ورنہ بخش دے اپنی کسی بھائی کو (کاشت کرنے کے لئے) اور اس سے بھی اگر انکار کرے تو چاہئے کہ روک لے اپنی زمین کو

بخاری کے سوا صحاح کی عام کتابوں میں یہ روایت آپ کو مل جائے گی۔

دوسری روایت وہی ہے جس میں ذکر کیا گیا ہے کہ بنی حارثہ کے زمینداروں کو کرایہ کی ممانعت فرماتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی کہا تھا کہ

ازرعوھا او ازرعوھا او امسکوھا۔ (بخاری)

خود کاشت کرو، یا اس میں کاشت کراؤ یا روک لو اس زمین کو

ان دونوں روایتوں کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ زمین کا مالک خود جوتے بوئے اور کاشت کرے، یہ مطلب تو ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ "ازرعوھا" یا "فلیزرعھا" کا۔

۲۔ باقی دوسری روایت میں ازرعوھا کے بعد ازرعوھا کا جو لفظ ہے، حافظ ابن حجر نے اعراب کی تصحیح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسرے لفظ کا ہمزہ ہمزہ قطعی ہے اور سراء کا حرف مکسور یعنی باب افعال سے امر کا صیغہ ہے (کاشت کراؤ) اسی لئے اس کا ترجمہ میں نے کیا تھا مطلب

یہ ہے کہ خود کاشت نہ کرے، یا نہ کر سکتا ہو، تو جیسے آدمی اپنا مکان خود اگر نہ بنا سکے، بلکہ مزدوروں سے بنواتا ہو اور مکان بنانے کے سارے مصارف خود اپنی طرف سے ادا کرتا ہے، اسی طرح حکم دیا گیا ہے کہ دوسروں سے زمین کا مالک کاشت کرائے اور کاشت میں جو کچھ خرچ ہو اس کا بار خود اٹھائے، ظاہر ہے کہ اس کا دروازہ کھلا نہ رکھا جاتا تو اس کے معنی یہی ہوتے کہ آدمی یا تو اپنا کھانا خود پکائے ورنہ دوسروں سے پکوا کے نہیں کھا سکتا، یا کپڑے خود بُنے اور خود سیئے ورنہ دوسروں کا بنا ہوا یا سیا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا۔ الغرض زندگی کی ساری ضرورتوں کو ہر شخص یا خود پوری کرے ورنہ دوسروں کو معاوضہ اور مزدوری دیکر کام نہیں کرا سکتا۔

کیا انسان کا اجتماعی نظام اس کے بعد باقی رہ سکتا ہے؟

۳۔ تیسرا مشورہ وہی ہے جو لیمنحھا اخاہ کے الفاظ کا مفاد ہے یعنی بخشدے زمین اپنے بھائی کو" جس کا لفظی ترجمہ کرنا چاہئے، حافظ ابن حجر نے شرح کرتے ہوئے لکھا ہے

ای یجعلھا منیحۃً ای عطیۃ

یعنی بطور عطیہ کے اپنے بھائی کو دیدے۔

صحیح مسلم کی دوسری روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسی سلسلہ میں یہ الفاظ جو منسوب کئے گئے ہیں کہ

من کانت لہ ارض فلیزرعھا فان عجز عنھا فلیمنحھا اخاہ المسلم ولا یواجرھا۔ (مسلم)

جس کے پاس زمین ہو چاہئے کہ اسکی خود کاشت کرے اور خود کاشت کرنے سے عاجز ہو تو اپنے کسی بھائی مسلمان کو دیدے جس سے معاوضہ نہ لے۔

حاصل سب کا وہی ہے کہ جو نہ خود اپنی زمین میں کاشت کر سکتا ہو اور نہ کاشت کرانے کے مصارف برداشت کرنے کی اس میں صلاحیت ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ گویا یہ تھا کہ جیسے پسماندہ سرمایہ روپے کی شکل میں کسی کے پاس اگر رہ جائے تو حاجتمندوں کو بغیر سود کے قرض دے کر اخروی ثواب حاصل کرنے کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے، اسی طرح چاہئے کہ زائد از ضرورت زمین کو بطور منیحہ کے ضرورتمندوں کو جوتنے بونے کیلئے دیدے اور اس کے معاوضہ میں خواہ بشکل نقد یا پیداوار کچھ نہ لے، جیسے قرض روپے کا کچھ نہ لیتا۔

سچی بات تو یہی ہے کہ حدیث کا یہ بھی حصہ "الغائے زمینداری" کے لئے کافی تھا۔

۴۔ آخری بات یہ فرمائی گئی کہ مذکورۂ بالا مشوروں میں سے کسی مشورہ کو جو قبول نہیں کرتا یعنی نہ خود کاشت کرتا ہے نہ کاشت کراتا ہے اور نہ کسی حاجت مند کو بغیر معاوضہ دینے پر اس کا دل راضی ہو تو حکم دیا گیا ہے کہ

فلیمسک ارضہ

پس اپنی زمین کو روک لے۔

حیرت ہوتی ہے کہ پیغمبر کے اس آخری مشورے اور حکم کے متعلق دلوں میں خدا جانے یہ سوال کس طرح ہوا، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ

فی امساکھا بغیر زراعۃ تضییعاً لمنفعتھا فیکون فیہ اضاعۃ المال، (فتح الباری جلد ۱۵ ص ۱۸)

بغیر کاشت کے زمین کو روک لینے میں تو زمین کے نفع سے محرومی کا اندیشہ ہے، مال کو ضائع کرنے کی یہ صورت ہوگی۔

شاید ان لوگوں کو زمین کی آبادکاری کے متعلق اسلامی حکومت کے ان تعمیری اختیارات کا علم نہ تھا جن کی بنیاد پر غیر آباد زمین کے مالک اور زمیندار کو حکومت کی طرف سے یہ نوٹس دی جاتی ہے کہ

ان عجزت عن عمارتھا عمرناھا وزرعناھا

اگر اس زمین کے آباد کرنے کی صلاحیت تجھ میں نہیں ہے تو ہم اس زمین کو آباد کریں گے اور اس میں کاشت کرینگے۔

حکومت کے نوٹس کے ان الفاظ کو نقل کرکے علامہ ابوبکر جصاص نے لکھا ہے۔

کذلک یفعل الامام عندنا بارا ضی العاجزین عمارتھا (احکام القرآن ج ۳ ص ۵۳۲)

اپنی زمینوں کی آبادی سے جو معذور ہوں ان کی زمینوں کے متعلق امام (حکومت) کو یہی کرنا چاہئے۔

قرآنی نصوص جن میں زمین کی آبادکاری کا مطالبہ کیا گیا ہے، بعضوں کا ذکر اس کتاب میں کر چکا ہوں، نیز عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ کے بیسیوں وثائق اور نظائر پر حکومت کے ان "تعمیری اختیارات" کی بنیاد قائم ہے جس کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔

میری کتاب اسلامی معاشیات میں آپ ایک اسلامی صوفی کی تحریر کا مطالعہ کیجئے جس میں لکھا گیا ہے کہ جس زمین سے مثلاً دس من پیداوار نکالنے کی صلاحیت ہو لیکن غفلت اور کاہلی کی وجہ سے بجائے دس من کے نو من پیدا ہو تو جس کی سہل انگاری سے پیداوار میں کمی ہوئی وہ قیامت کے دن ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا کہ مخلوق خدا اس کے فعل کی وجہ سے اس روزی سے محروم ہو گئی جس سے مستفید ہونے کا امکان موجود تھا۔

سچ پوچھئے تو اس قسم کے گشتی فرامین خود حکومت کی طرف سے جاری ہوا کرتے تھے، مثلاً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فرمان کے الفاظ اسی سلسلہ میں کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں کہ اپنے گورنروں کو لکھا کرتے:

لا تدعوا الارض خرابا (جلد ۸ ص ۲۱۶ محلی ابن حزم)

زمین کو غیر آباد ہرگز نہ چھوڑنا۔

یا ان ہی کے فرامین میں ہوتا:

لا تبتزن قبلك ارضاً (کتاب الخراج ص ۶۳)

کوئی زمین تمہارے علاقہ میں آباد ہوئے بغیر نہ رہ جائے۔

حاصل سب کا یہی تھا کہ خدا کی زمین اور اس کی پیداواروں میں اضافہ کی کوئی ممکن صورت چھوڑی نہ جائے، عمر بن عبدالعزیزؒ اسی لئے اپنے والیوں کو بار بار تاکید کے ساتھ لکھا کرتے تھے کہ نصف محاصل پر کسان زمینوں کو بندوبست لینے پر اگر تیار نہ ہوں تو

فاعطوھا بالثلث فان لم یزرع فاعطوھا حتی یبلغ العشر

تو تہائی پر بندوبست کردو، اگر پھر بھی آباد نہ ہو تو دسویں حصہ کی شرط پر دیدو۔

اور آخر میں تو یہ بھی اجازت دیدی جاتی

فان لم یزرعها احد فامنحها

پھر بھی کوئی کسی زمین کو آباد نہ کرے تو لوگوں کو یوں ہی مفت آباد کرنے کے لئے دیدو۔

تا اینکہ جس زمین کو مفت لینے پر بھی کوئی آمادہ نہ ہو تو عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکم تھا کہ

فان لم یزرع فانفق علیہا من بیت مال المسلمین

پھر بھی زمین آباد نہ ہو تو حکومت کے خزانے سے خرچ کرکے غیر آباد زمین کو آباد کرو۔

آپ دیکھ رہے ہیں زمین کی آبادکاری کے ان بے پناہ ولولوں کی کوئی ممکن صورت ایسی باقی رہ گئی ہے، جو چھوڑ دی گئی ہو۔

روم و ایران کی زرعی زمینوں سے متسلطین و متغلبین کو نکالنے کے بعد جن فیاضانہ شرائط کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کو بندوبست کرتے چلے جاتے تھے، کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھئے، نجران کے سودخوار سرمایہ داروں کو بھی معاوضہ دیکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں کی زرعی زمینوں کو ان سے لیکر کاشتکاروں کے ساتھ بندوبست کرنا چاہا تو لکھا ہے کہ

ان جاؤا بالبقر والحدید من عندھم فلھم الثلثان ولعمر الثلث وان جاء عمر بالبذر من عندہ فلہ الشطر (فتح الباری ج۹ ص۵)

اگر بیل اور لوہا کسانوں کی طرف سے مہیا کیا جائے تو ان کو دو تہائی پیداوار کا ملیگا اور عمر (یعنی حکومت) کو تہائی، اور تخم کا بندوبست اگر عمر (کی حکومت) کرے تو کسانوں کو نصف حصہ ملے گا۔

الغرض یہی چاہا جاتا تھا کہ خدا کی زمین سے خدا کی مخلوق جس حد تک مستفید ہوسکے اس میں کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑا جائے۔

اور میرا تو خیال ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، زمین کی آبادکاری کی ان ساری دلچسپیوں میں نسل انسانی کے سب سے بڑے بہی خواہ اور اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی عملی و قولی قوت پوشیدہ تھی، قولی حدیث کا ذکر کر چکا ہوں کہ پرند چرند حتیٰ کہ چور چکار سب ہی کا کھایا ہوا آبادکاروں کی طرف سے صدقہ (یعنی نیکی) ہے گویا پیدا کرنے میں صرف انسانوں ہی کا خیال نہ کرنا چاہئے بلکہ چرند پرند اور سارے جانداروں کو سمجھنا چاہئے کہ اس سے مستفید ہوں گے۔

انہی حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جن کی ہتھیلیوں میں کدال اور پھاوڑے کے گھٹے پڑے ہوئے تھے، امام محمد بن حسن الشیبانی کی کتاب الکسب کے حوالہ سے شمس الائمہ سرخسی نے نقل کیا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھٹے پڑے ہوئے ہاتھوں کو چومتے جاتے تھے اور فرما رہے تھے

کفان یحبھما اللہ تعالیٰ (جلد ۳ ص۲۴۵) (خدا کی دونوں محبوب ہتھیلیاں ہیں۔

اس سے زیادہ زمین اور اس کی آبادی کی اہمیت کے اعتراف و اعلان کی عملی مثال شاید انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

انصاف سے اگر دیکھا جائے تو کائنات کی ابتداء و انتہا یعنی مبدء و معاد کے متعلق قوموں میں مبہم مبہم الجھے ہوئے احساسات و معلومات جو پائے جاتے تھے ان ہی کو انتہائی سادہ متین اور واضح شکلوں میں پیش کرکے دنیا کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ذہنی کوفت اور روحانی بےچینیوں سے نجات کی جو راہیں کھولی ہیں ابدی زندگی کے ارتقاء و تنزل کے ہر نشیب و فراز سے آگاہی آپ کے ذریعہ جو کچھ حاصل ہوئی اور

اسی کے ساتھ "مستقر الی حین" (چند روزہ قیامگاہ) والی دنیا کی عبوری زندگی کی پیچ در پیچ گتھیوں کو آپ نے سلجھایا شخصی، خاندانی اور عالمی، قومی و بین الاقوامی، عام انسانی تعلقات کے ہر ہر شعبہ میں آدم کی اولاد کو آپ کے طفیل میں وہ سب کچھ ملا جس کی وہ محتاج تھی ان ساری باتوں سے قطع نظر کرکے اراضی اور زمینوں کی آبادکاری کے مسئلہ میں جو کچھ بتا کر آپ تشریف لے گئے، اور چند ہی فقروں میں مسئلہ کے تمام منفی و ایجابی پہلوؤں کے متعلق آخری فیصلہ آپ نے جو کر دیا ہے، میرا خیال تو یہی ہے کہ اپنے نبی کے پہچاننے کے لئے صرف یہی ہر اس شخص کے واسطے کافی و وافی ہو سکتا ہے جو خواہ مخواہ پہچاننے سے گریز ہی کا ارادہ کئے ہوئے نہ ہو، سوچئے اور خوب سوچئے، جو کچھ کہدیا گیا تھا، کیا اس کے بعد کچھ اور سوچنے کی گنجائش باقی رہ گئی ہے، کچھ نہ ہوتا تو ان ہی فیصلوں کی بنیاد پر اصلاح آراضی کا بجا پیغمبر چاہئے کہ دنیا آپ کو تسلیم کرے، آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے استاد مرحوم سیدنا الامام الکشمیری کے ایک خاص علمی نکتہ کا ذکر یہاں کر دیا جائے، مطلب یہ ہے کہ قضاءً و دیانۃً کی عام اصطلاحیں فقہا اور ہمارے مولویوں کے یہاں مستعمل ہیں، مختلف معاملات کے متعلق کہدیا جاتا ہے کہ قضاءً صحیح نہیں ہے لیکن دیانۃً صحیح ہے، یا بالعکس دیانۃً صحیح نہیں ہے، قضاءً درست ہے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مقصد اس کا یہ ہوتا ہے کہ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کی قانون یعنی اسلامی قانون میں گنجائش نہیں ہوتی اور قانوناً ان کو درست نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان معاملات کے کرنے والوں کو ہر حال میں مذہب اور دین کا گنہگار اور مجرم ٹھہرایا جائے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ بخاری کی املا کی شرح فیض الباری میں جو نقل کئے گئے ہیں، ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، فرمایا کرتے تھے۔

فدل علیٰ انہ لا یلزم من کون الشئ باطلا او فاسداً کونہ معصیۃ (ج ۳ ص ۲۹)

پس معلوم ہوا کہ کسی شے کا (قانون) کے رو سے غیر صحیح یا درست نہ ہونا ضروری نہیں کہ وہ گناہ بھی ہو۔

پھر بعض فقہی کتابوں سے مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

من ھٰھنا تبین ان من زعم بین کون الشی باطلا ومعصیۃ تلازما فقد حاد عن الصواب (ص ۰)

اسی سے یہ ظاہر ہو گیا کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی معاملہ کا صحیح نہ ہونا اور اس کا گناہ ہونا دونوں میں تردم ہے، وہ راہِ ثواب سے ہٹے ہوئے ہیں۔

اپنے اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر "مزارعت" یعنی زمینداری کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس فتوی کا تذکرہ کرکے یعنی مزارعت کا معاملہ امام کے نزدیک درست نہیں ہے، بایں ہمہ مسلمان اس معاملہ کو کرتے چلے آئے ہیں اور آج تک کر رہے ہیں۔ شاہ صاحب نے اس موقع پر بھی اپنے اسی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے کہ

قد بینا لک، فیما مر ان الشئ قد یکون باطلا ولا یکون معصیۃ (ج ۲ ص ۲۹۵)

میں آگاہ کر چکا ہوں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قانوناً ایک معاملہ درست نہیں ہے لیکن بایں ہمہ وہ معصیت یعنی دینی گناہ بھی نہیں ہے۔

ممکن ہے کہ عام لوگوں کیلئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ اصولی بات کچھ عجیب سی ہو لیکن دین کی ایک حیثیت دین کی ہے اور دین ہی کا

ایک حصہ قانون بھی ہے، اربابِ بصیرت ہی اس کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ دین کا جو قانونی حصہ ہے اس کے کون سے دفعات ایسے ہیں جن کا ارتکاب قانونی جرم بھی ہے اور دینی معصیت بھی ہے اور ایسے دفعات کون ہیں جن میں یہ رنگ نہیں پایا جاتا، خود عہدِ صحابہ میں بھی اس قسم کے خیالات کا سُراغ ملتا ہے مثلاً مشہور صحابی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف یہ قول صحاح ہی کی کتابوں میں منسوب کیا گیا ہے کہ زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنے کی ممانعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی ہے، اس کا جب چرچا ہوا تو زید بن ثابتؓ نے فرمایا کہ واقعہ یہ ہے کہ

انما اتاہ رجلان من الانصار اقتتلا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کان ھذا شانکم فلا تکروا المزارع (ابوداؤد و نسائی)

انصار کے دو آدمیوں میں جھگڑا ہوا، دونوں رسول اللہؐ کے پاس آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تب فرمایا، تمہارا یہی حال ہے تو کھیتوں کو کرایہ پر نہ دیا کرو۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ بجائے کلی قانون کے حضرت زید بن ثابتؓ کا خیال تھا کہ ایک شخصی مشورہ جھگڑے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، مقصد مبارک یہ تھا کہ سرے سے کرایہ پر زمینوں کے بندوبست کرنے کی آپ نے ممانعت فرمادی تھی، اس میں شک نہیں کہ حضرت زیدؓ کی تاویل ان واقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جن کا ذکر اس سلسلہ میں کیا گیا ہے مشکل ہی سے قابلِ قبول ہو سکتی ہے بنی حارثہ کے زمینداروں کو جن مختلف طریقوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حکم بھیجا تھا، اس کے بعد کیسے مانا جائے کہ شخصی جھگڑے کے موقع پر ایک وقتی مشورہ دیا گیا تھا لیکن کچھ بھی ہو، اتنا تو اس سے سمجھ میں آیا کہ ہر حکم کو دینی قانون میں شریک کر کے مذہبی گناہ کا خلاف ورزی کرنے والوں کو قرار دینا، خود صحابۂ کرام ہی کا یہ نقطۂ نظر نہ تھا اور حضرت زیدؓ سے زیادہ اس باب میں بخاری وغیرہ کی وہ روایت ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کو ظاہر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان الفاظ میں اس کی تعبیر کرتے تھے کہ

لان یمنح احدکم اخاہ ارضہ خیرلہ من ان یاخذ علیھا خرجا معلوما۔

اپنے بھائی کو (بلا معاوضہ) اپنی زمین (کاشت کرنے کیلئے) کوئی دے، یہ اس سے بہتر ہے کہ زمین کا معاوضہ لے۔

آپ دیکھ رہے ہیں ابن عباسؓ کی تعبیر سے مسئلہ کا رنگ کیا ہو گیا گویا ایک بہی خواہانہ مشورہ تھا جو لوگوں کو دیا گیا تھا

بہرحال جب عہدِ صحابہ ہی میں اس قسم کے خیالات مسئلہ زمینداری کے متعلق پیدا ہو چکے تھے، تو آئندہ ان مسلمانوں سے اس کی شکایت بے جا شکایت ہوگی، جو آج تو خیر جس حال میں بھی ہوں آج سے صدیوں پہلے اپنے عہد کے مسلمانوں کو دیکھ کر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا تھا،

چوں دولتِ عرب منقضی شد مردم در بلادِ مختلفہ افتادند و ہر یکے آنچہ از مذاہب یاد گرفتہ بود ہمانرا اصل ساخت و آنچہ مذہب مستنبط سابقانِ بود الحال سنۃ مستقرہ شد، علم ایشاں تخریج بر تخریج و تفریع بر تفریع و دولتِ ایشاں مانند دولتِ مجوس الا آنکہ نمازی گذارند و متکلم بکلمۂ شہادت می شدند۔

جب عرب کی دولت کا زوال ہوگیا اور مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئے' تو جن لوگوں کے پاس مذہب کے متعلق جو معلومات تھے ان ہی کو بنیاد بنا کر اور ان سے جو نتائج پیدا ہو سکتے تھے اسی کو ایک مقررہ قاعدہ لوگوں نے بنا لیا، ان لوگوں کا علم صرف اس حد تک محدود ہو کر رہ گیا کہ ان ہی معلومات سے نتیجے اور نتیجوں سے نتیجے پیدا کرتے چلے جاتے تھے، ان ہی کو نظیر بنا کر فیصلے کرتے رہے' اور مسلمانوں کی حکومت' ایرانیوں کی حکومت کے مانند بن کر رہ گئی' صرف نماز تو مسلمان پڑھتے رہے اور کلمۂ شہادت کو دہراتے رہے۔

روحانی کرب' اور قلبی درد کے ساتھ آخری الفاظ اسی موقعہ پر شاہ صاحب کے قلم سے جو ٹپک پڑے ہیں آپ بھی پڑھئے۔ فرماتے ہیں:

ما مردم درد امان ہمیں تغیر پیدا شدیم، نمیدانیم خدائے تعالیٰ بعد ازیں چہ خواستہ است (ازالۃ الخفا ج ۱ ص ۱۵۰)

ان ہی انقلابی دنوں میں ہم لوگ پیدا ہوئے۔ کچھ نہیں معلوم کہ حق تعالیٰ کی آئندہ مرضی کیا ہے۔

استدراک

یہ ہے گیلانی صاحب کی تحقیق کی رو سے احادیث کی روشنی میں اس سوال کا جواب کہ رسول اللہ صلعم کے عہد ہمایونی میں زمینداری کو جائز قرار دیا گیا تھا یا نہیں۔ وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ بالکل واضح ہے کہ حضورؐ نے اس کی شدت سے مخالفت فرمائی تھی، لیکن اس کے برعکس امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے زمین کی ملکیت پر ایک کتاب لکھ ڈالی تھی جس میں انہوں نے احادیث ہی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ زمین پر ذاتی ملکیت بے حد و نہایت جائز ہے اور زمیندار کو حق حاصل ہے کہ وہ کاشتکاروں سے زمین کا حق مالکانہ وصول کرے۔ یہ بحث تو اب گیلانی صاحب اور مودودی صاحب کے مابین رہیگی، کہ کس کی پیشکردہ احادیث صحیح ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے حکیم حیدر زماں صدیقی مرحوم نے بھی مودودی صاحب کو ٹوکا تھا' وہ زمینداری جیسی مفاد پرستانہ خون آشامی کو ناحق نبی اکرم صلعم کی طرف منسوب کر رہے ہیں تو اس کے جواب میں مودودی صاحب نے کہا تھا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے کہا تو کچھ اور تھا لیکن راوی صحابہ نے سمجھ کچھ اور لیا اور حدیث کو اپنے مفہوم کے مطابق روایت کر دیا اور جب یہ کہا گیا کہ انھیں کیسے معلوم ہو گیا کہ رسولؐ اللہ نے کچھ اور کہا تھا تو اس کا جواب واضح تھا کہ یہ باتیں اسناد سے معلوم نہیں کی جا سکتیں انھیں کوئی مزاج شناس رسول ہی بتا سکتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے کیا کہا ہوگا اور اگر رسولؐ اللہ آج موجود ہوتے تو کیا کہتے۔

جہانتک طلوع اسلام کا تعلق ہے بات بالکل صاف ہے۔ اس کے نزدیک معیار یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف جاتی ہے وہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اسلئے کہ ہم اس کا تصور تک کرنے کیلئے تیار نہیں کہ رسول اللہؐ کا کوئی عمل یا ارشاد قرآن کے خلاف ہو سکتا تھا رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ قرآن کی اتباع میں گذرا اسلئے کوئی ایسی بات جو قرآن کے خلاف ہو اور اسے رسول اللہ صلعم کی طرف منسوب کر دیا جلئے اسے کبھی صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کے راویوں میں حضرت جبریلؑ تک کا بھی نام کیوں نہ شامل کر دیا گیا ہو' اور خواہ کوئی مزاج شناس رسول یہ بھی کیوں نہ کہدے کہ میں نے رات اس کے متعلق رسول اللہ صلعم سے خود دریافت کیا تھا۔

جیسا کہ طلوع اسلام ایک عرصہ سے کہتا چلا آ رہا ہے اور جیسا کہ اب محترم گیلانی صاحب نے بھی بیان کیا ہے۔ زمین اسی طرح انسانی زندگی کی پرورش کا ذریعہ ہے جس طرح پانی، ہوا، روشنی، یہ سب سامان پرورش خدا کے کائناتی قانون ربوبیت کے ماتحت

مفت عطا ہوا ہے اور کسی کو حق حاصل نہیں کہ ان چیزوں پر حد بندیاں قائم کرکے انھیں اپنی ملکیت میں لے لے۔

ہم اس یوم سعید کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں جب محترم پرویز صاحب اپنی تصنیف "قرآنی نظامِ ربوبیت" کی تکمیل سے فارغ ہو جائیں تو دنیا کے سامنے یہ حقیقت آجائے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ربوبیت کا کیا نقشہ پیش کیا تھا اور اسے ہماری تاریخ کے مفاد پرستانہ دَور نے کس طرح مسخ کرکے رکھدیا جس کی وجہ سے ساری دنیا اور ان کے ساتھ ہی مسلمان بھی معاشرتی جہنم میں گرفتار ہیں۔ جہاں تک ان کے درس قرآنی اور نجی صحبتوں میں تذکرہ سے مترشح ہوتا ہے یہ کتاب پہلی مرتبہ قرآنی نظام کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کریگی عجب کہ ان کی یہی کوشش کاروانِ انسانیت کو اس راستہ کی طرف راہنمائی کردے جس کی تلاش میں جنت سے نکلا ہوا آدم اس بری طرح سے مارا مارا پھر رہا ہے۔

طلوع اسلام

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے

جون ۱۹۵۳ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے۔ لہذا آئندہ ماہ جولائی ۱۹۵۳ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ر جون ۱۹۵۳ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ر جون سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرمادیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہو گیا ہے

۱۱۸ — ۱۶۵ — ۲۹۲ — ۳۳۱ — ۴۰۷ — ۵۱۹ — ۵۲۱ — ۵۲۲ — ۵۲۶ — ۵۳۴ — ۵۷۱/۱۲۵۷ — ۷۵۰ —

۷۷۷ — ۹۱۵ — ۹۱۶ — ۹۱۷ — ۹۱۹ — ۹۲۰ — ۹۲۱ — ۹۲۲ — ۹۲۳ — ۹۲۵ — ۹۳۱ — ۹۳۷ — ۹۳۹ —

۹۴۷ — ۹۴۸ — ۹۴۹ — ۹۵۰ — ۹۵۱ — ۹۵۲ — ۹۵۷ — ۹۵۸ — ۹۵۹ — ۹۶۰ — ۹۶۱ — ۹۶۵ — ۹۶۶ — ۹۶۷ —

۹۶۸ — ۹۶۹ — ۹۷۰ — ۹۷۱ — ۹۷۲ — ۹۷۳ — ۹۷۴ — ۹۷۶ — ۹۷۸ — ۹۸۲ — ۹۸۳ — ۹۸۵ — ۹۸۷ — ۹۸۸ —

۹۸۹ — ۹۹۰ — ۹۹۱ — ۹۹۲ — ۹۹۳ — ۹۹۴ — ۹۹۵ — ۱۰۰۹ — ۱۰۱۰ — ۱۰۱۱ — ۱۰۱۲ — ۱۰۱۴ — ۱۰۱۵ —

۱۰۲۴ — ۱۱۰۷ — ۱۱۰۸ — ۱۲۵۱ — ۱۲۵۷ —

باب المراسلات

ابوذر غفاریؓ کے بعد

سُنا ہے کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے امیر حبیب اللہ مرحوم والی افغانستان کو اپنے مسیح موعود ہونے کا دعوت نامہ بھیجا۔ امیر مرحوم نے جواب دیا، مرزا صاحب محترم! معاف فرمایئے آپ سے غلطی ہوئی۔ اب اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ واپس تشریف لیجایئے اور حضرت عمر فاروقؓ کو بھیجدیجئے۔ کیوں کہ مسلمانانِ عالم اس وقت جس عجز و مسکنت کی حالت میں رہ رہے ہیں اس کا علاج مسیحؑ نہیں عمرؓ ہے۔ مسیحیت کے ساز سے قیصریت زندہ باد کے سوا کوئی نغمہ نہیں نکل سکتا، محکوم کے لئے اس کے پاس یہی پیام ہو سکتا ہے کہ "محکوم تر" ہو کر رہے۔

یہ تھی ایک شاہی دماغ کی رسائی اور مرزا صاحب بیچارے ایک دیہاتی مولوی قسم کے آدمی تھے، اور مولوی کا ذہن اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا تھا کہ فلاں حدیث میں مسیحؑ کی آمد کی پیش گوئی کی گئی ہے، اور مسلمان اس کا انتظار کرتے آرہے ہیں۔ یعنی زمین تیار ہے صرف ذرا تخم پاشی کی ضرورت۔ چنانچہ انھوں نے ذرا دیکھ بھال کر آہستہ آہستہ مولوی، مناظر، مصنف، مجدد، مہدی وغیرہ زینوں کو طے کرتے ہوئے منارۂ مسیح پر ہلّہ بول دیا۔ اب کیا تھا، کچھ لوگ امت سے کٹ کر اپنے انتظار کو تسکین دینے کے لئے ان کے ساتھ ہو گئے، دکان چل پڑی۔ اور لوگوں کا کیا ہے وہ تو بڑے ہی علم و دانش کے باوجود گائے کو خدا ماننے اور منوانے کیلئے کٹ مرتے ہیں، حالانکہ اس بے چاری نے اپنے متعلق کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اور دوسری طرف خدا نے لاکھوں پیغمبر اپنی توحید کو منوانے کے لئے بھیجے پھر بھی اس کا جو نتیجہ ہے ظاہر ہے۔ بہرحال لوگوں کا کسی کے پیچھے لگنا یا نہ لگنا اس کی صداقت یا عدم صداقت کی دلیل نہیں۔

ہمارے روایت زاد مسیح موعود سے بہت آگے دانش مندانِ مغرب محض دانشِ آزاد کی دستگیری سے وہاں پہنچ گئے، جہاں ان کو ان کی "نبوت وحی" بھی نہ پہنچا سکی۔ تمام عمر بے وقت کا راگ الاپتے رہے اور اپنے بعد اسی صدائے بے ہنگام کو ایک خوفناک ٹریجڈی کی شکل میں چھوڑ گئے۔ اینگلز، کارل مارکس، ٹالسٹائی، لینن اور ان کے ہمنواؤں نے وقت کی نبض پر انگلی رکھی اور انسانیت کے مزمن مرض کا پتا لگا لیا۔ انھوں نے اس کیلئے علاج بھی تجویز کیا جو اس وقت تجربے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو وہ خوش قسمت تھے کہ مذہبی روایات کے چکر میں گرفتار نہیں تھے اور خالص عقل کی روشنی میں کئی ایک حقائق کو دیکھنے میں کامیاب ہوئے۔ دوسری طرف ایک خامی بھی تھی کہ ان کے سامنے وحی خداوندی کا نور نہیں تھا جس کی مدد سے وہ اور زیادہ جزم و یقین کی منزل سے قریب ہو جاتے۔

اس وقت ہم امیر افغانستان کے زمانے سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ دنیا بدل گئی۔ اسلامی ممالک کے حالات بھی بہت

کچھ بدل چکے ہیں۔ اس وقت امیر المومنین عمرؓ کی ضرورت تھی تو آج کی ضروریات تقاضا کر رہی ہیں کہ مسیحیت کے دعویدار واپس تشریف لیجائیں اور ابوذر غفاریؓ کو بھیجدیں۔ وہ کام جو کارل مارکس، اینگلز، ٹالسٹائی اور لینن سے نہ ہو سکا، ان کی انسانیت پرور مساعی میں جس اہم چیز کی کمی رہ گئی وہ ہمیں ابوذر غفاریؓ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی پچھلی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں، ہماری نظر ایک ایک صدی کا جائزہ لیتی ہوئی پہلی صدی ہجری تک جا پہنچتی ہے۔ ہم ایک ابوذرؓ کے بعد دوسرا ابوذر تلاش کرتے ہیں لیکن ہمارے سامنے یہ تلخ حقیقت آتی ہے کہ اس ساری شاہراہ پر کوئی نہیں جسے اس کا ثانی کہا جا سکے۔ بلکہ یہ امر اور افسوسناک ہے کہ اس پہلے ابوذرؓ کے چہرے پر بھی جذب و دیوانگی کے نقاب ڈالے جا رہے ہیں تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے اور اس کی کوئی بات کان میں پڑ جائے تو اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے ـــــ حالانکہ ابوذر ہی وہ شخص ہے جس کے متعلق اسی ذخیرۂ روایت میں آنحضرتؐ کے یہ الفاظ موجود ہیں:-

ما اظلت الخضراء ولا اقلت الغبراء علی ذی لھجۃ اصدق من ابی ذر۔

آسمان کے سائبان کے نیچے اور روئے زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ سچا آدمی نہیں پایا گیا۔

اس حدیث پر محترم سوانح نگار کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔

کسی تصدیق و تزکیہ کے لئے اس سے زیادہ وزن دار، زیادہ روشن، تاباں الفاظ اور بھی مل سکتے ہیں اور کیا اس حدیث کو پیش نظر رکھنے کے بعد اگر ابوذرؓ کے دعوی کو نبوی دعوی یعنی مرفوع حدیث کا حکم دیدیا جائے تو اصولاً کوئی مانع ہو سکتا ہے"۔؟ [1]

یعنی ایک طرف تو ابوذرؓ کے دعوی کو دعوی نبوی اور ان کی بات کو اصولاً حدیث مرفوع کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ان کی آواز کو اسی وقت گلے کے اندر دبا دینے کی حاکمانہ کوشش کی جاتی ہے، چنانچہ اس کی تفصیل آپ" طلوع اسلام" کے مارچ نمبر میں دیکھ چکے ہیں۔ ڈھونڈنے والے کو آپ کے متعلق کچھ معلومات اصابہ، اسد الغابہ، استیعاب، طبقات ابن سعد، صحاح اور دیگر کتب حدیثیہ میں بکھری ہوئی ملیں گی ـــــ آگے بڑھ کر بہت سے صحابہؓ کو مختلف فرقوں کے مسلمانوں نے بہت شہرت دی، ان پر کتابیں لکھیں، ان کے دن منائے جا رہے ہیں، مقالے لکھے جا رہے ہیں لیکن ابوذرؓ کو ایک طرح سے گم کر دیا گیا۔ شاید اس لئے کہ اگر ابوذرؓ کا مشن زندہ ہو جائے تو وہ آیات قرآنی جو نظام قرآنی کی روح ہیں زندہ ہو کر سامنے آ کھڑی ہوں گی۔ آج جن اسلامی حقائق کو ملوکیت و ملائیت نے دبا رکھا ہے دنیا ان سے روشناس ہو جائے گی۔

حیرت اور مسرت کا مقام ہے کہ انسانی فلاح و بہبود کی سب سے بڑی ضرورت، قرآن کا سب سے اہم پیام، زمانے کا ٹھوس اور مقدم ترین مطالبہ جو بے شمار مصلحین، مجددین اور مدعیان مہدویت و مسیحیت کی نظر سے اوجھل رہ گیا، جس کے لئے ابوذرؓ نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ آج وہ ہمیں طلوعِ اسلام اور صرف طلوع اسلام کے صفحات میں بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ابوذرؓ کے بعد طلوع اسلام نے اس آواز کو اسی جوش، اسی خلوص اور اسی استدلال کے ساتھ بلند کیا ہے جس کی بنیاد ابوذرؓ نے رکھی تھی۔

---

[1] مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔

طلوع اسلام کے عام مضامین اور مکرمی پرویز صاحب کی تقریریں روح بوذری سے معمور ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے نہ کوئی فرقہ ہے نہ فرقہ بندی، بلکہ عام منشائے قرآن کے مطابق ان کے پیش نظر فلاح انسانیت ہے۔ قرآن پاک میں ہر زمانے کے دکھوں کی دوا موجود ہے۔ اس زمانے کا سب سے بڑا دکھ رزق کی غیر مساوی تقسیم ہے۔ یہ دکھ نیا نہیں لیکن اس کا احساس اب زیادہ ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ پوری دنیا کی بے اطمینانی کی جڑ یہی ہے، تمام جرائم کا سرچشمہ یہی ہے۔ یزداں سے دوری اور اہرمن کے تسلط کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔ قرآن پہلی کتاب ہے جس نے اس کا سدباب کیا اور جتنے دن قرآن کی حکومت رہی اور جہاں جہاں رہی اتنے دن وہاں سے یہ دکھ کوچ کر گیا اور یہ وقت بہت تھوڑا تھا، یہانتک کہ صحابہ ہی کی زندگی میں عہد قرآنی کا خاتمہ شروع ہو گیا۔ یہ ہم کو ابوذرؓ کے حالات اور تاریخ کے دیگر افسوسناک ابواب سے معلوم ہو جاتا ہے۔ آج ابوذرؓ کی آواز طلوع اسلام کے ذریعے سے پھر بلند ہو رہی ہے۔ ابوذرؓ جن آیاتِ قرآنی سے استدلال کرتے تھے اور جو مُلّا کے نزدیک محض تلاوت یا سادہ ترجمہ سے زیادہ توجہ کی مستحق نہیں رہ گئی تھیں۔ طلوع اسلام میں ان پر مقالے نکل رہے ہیں بلکہ تصانیف تیار ہو رہی ہیں۔ یہ مقالے اور تصانیف اگر مغربی زبانوں میں منتقل ہو سکیں اور کوئی انسانی جماعت ان کو تجربہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہو تو عصر حاضر کی مضطرب انسانیت اپنے بنائے ہوئے تمام "ازموں" کو چھوڑ کر اس کے پیچھے چل پڑے۔

(عرشی)

معاملہ کی باتیں

ان تمام امور کی سختی سے پابندی کیجئے

(۱) خط و کتابت میں اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت نہ فرمایئے ــــ (۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ بھیجئے ــــ (۳) رسالہ ہر ماہ ۳۰ تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو بروقت پرچہ نہیں ملا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا پرچہ محکمۂ ڈاک کی غفلت سے ضائع ہو گیا اسلئے پندرہ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیجئے ــــ (۴) ڈاکخانہ کی طرف سے رسالہ کی روانگی کے لئے ۵، ۱۰، ۲۰، ۳۰ تاریخیں مقرر ہیں، ان تاریخوں کے علاوہ ہم دوسری کسی تاریخ میں پرچہ نہیں بھیج سکتے۔ اگر آپ نے دفتر کو کوئی شکایت تحریر فرمائی ہے تو تعمیل کیلئے ان تاریخوں کا انتظار فرمایئے ــــ (۵) آپ کا چندہ ختم ہو گیا ہے تو دفتر سے آپ کو ایک جوابی کارڈ بھیجا گیا ہے اس کا فوری جواب دیجئے۔ اگر آپ جواب نہیں دے رہے تو آئندہ پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی حاضر ہوگا جس کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہے ــــ (۶) ادارۂ طلوع اسلام ایک تبلیغی ادارہ ہے وی پی منگا کر واپس کر دینا اخلاقی جرم کے علاوہ ایک تبلیغی ادارہ کو نقصان بھی پہنچانا ہے ــــ (۷) اگر آپ رسالہ کے ایجنٹ ہیں اور آپ رسالہ کی ایجنسی جاری رکھنا نہیں چاہتے تو ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے ادارہ کو اطلاع دیجئے اور بلاوجہ ادارہ کو نقصان نہ پہنچایئے۔

منیجر ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

کیا آپ اس اسکیم میں شامل ہو گئے ہیں؟

اسکیم معاونین طلوعِ اسلام

طلوع اسلام جس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اور جس نظامِ ربوبیت کا نقیب، اس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسوقت تمام عالمِ اسلامی میں یہ آواز کہیں اور سے نہیں اٹھ رہی۔ ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں کو پھر اُس نظام سے روشناس کرایا جا رہا ہے جسے قرآن نے پیش کیا اور محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کیا۔

طلوع اسلام کی یہ آواز بالکل محدود ہے اور زمانے کا تقاضا ہے کہ اسے دور دور تک پھیلا دیا جائے، نہ صرف پاکستان میں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں۔ نہیں! بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی۔ یہ کام آپ کی معاونت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس معاونت کی شکل یہ ہے کہ آپ

معاونینِ طلوعِ اسلام کے حلقے میں

شامل ہو جائیں۔ اس کیلئے آپ ایک سو روپیہ (یکمشت یا چار ماہانہ اقساط میں) ادا فرما دیں۔ اس کے بدلے میں دو سال تک رسالہ طلوع اسلام اور اس دو سال میں جتنی کتابیں ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع ہوں

آپ کو بلا قیمت ملتی رہیں گی

اگر دو سال کے عرصہ میں ادارہ ایک سو روپیہ کی مالیت کی کتابیں شائع نہ کر سکا تو اس میعاد میں اضافہ کر دیا جائیگا۔ بہرحال ایک سو روپیہ کی مالیت کی کتابیں آپ کو ادارہ کی طرف سے خود مہیا کی جائیں گی ـــــ آپ خود بھی اس حلقے میں شامل ہو جائیے اور اپنے احباب کو بھی شامل ہونے پر آمادہ کیجئے۔ آپکی اس معاونت سے یہ آواز دور دور تک پھیل جائیگی۔ کیا عجب کہ آپ کی یہ رفاقت اس قرآنی انقلاب کو قریب تر لے آئے جس کیلئے انسانیت اس طرح تڑپ رہی ہے ـــــ صرف ایک سو روپیہ۔ بذریعہ منی آرڈر (بذریعہ چیک نہیں) بنام

ناظم ادارۂ طلوع اسلام، کراچی

ارسال فرما دیجئے اور اپنا پورا پتہ بھی لکھ دیجئے۔ اس رقم کی رسید آپ کو الگ بھیج دی جائیگی ـــــ طلوع اسلام کی اس اسکیم کو کامیاب بنائیے ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ آواز آگے بڑھنے سے رک جائے۔ اسوقت دنیا کو قرآن کے قریب لانے کیلئے حالات بڑے امید افزا ہیں۔ دنیا خود اس کی تلاش میں ہے۔ اس کوشش میں ہمارا ہاتھ بٹائیے۔ اس لئے کہ یہ ہمارا اور آپ کا مشترکہ مقصد ہے۔

ہمارے پاس قرآنی نظامِ ربوبیت سے متعلق بہت سا لٹریچر تیار رکھا ہے لیکن وہ آپ کی معاونت کے بغیر شائع نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنے مقدور کے مطابق کوشش کر رہے ہیں، آپ اپنے مقدور کے مطابق ہمارا ساتھ دیجئے۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی